عبدالرزاق صاحب قریشی نے یہ مجموعۂ مکاتیب شائع کرکے ایک اچھی علمی خدمت انجام دی ہے، شروع میں قریشی صاحب نے ۲۷-۲۸ صفحے کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے، جو قابلِ تحسین ہے، آخر میں بطورِ ضمیمہ ان کی دو اور مختلف تحریریں بھی شامل کردی گئی ہیں، اور پھر تشریحات کے عنوان سے ان خطوط میں جو قابلِ ذکر اشخاص، واقعات اور مقامات وغیرہ آئے ہیں، ان کی تفصیل بھی دے دی ہے، اس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے، اس کی اشاعت سے مرزا صاحب کی زندگی کی ایک دستاویز ہاتھ آگئی،

اخبار الاخیار

از شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ، صفحات ۵۲۳، کتابت و طباعت متوسط

ناشر دار الاشاعت مولوی مسافرخانہ بندر روڈ، کراچی ۱

یہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا مشہور فارسی تذکرہ اخبار الاخیار کا ترجمہ ہے، اس میں تقریباً تین سو علماء و صوفیہ کے حالات ہیں، آخر میں مجدد الف ثانیؒ اور خود مصنف کے حالات شامل کردیے گئے ہیں،

پاکستان میں اردو ترجمہ کا کام جس تیزی سے ہو رہا ہے وہ قابلِ ستائش ہوتے ہوئے کچھ توجہ کا بھی محتاج ہے، کاش یہ ناشر حضرات ترجمہ کا کام ایسے قابلِ اعتماد لوگوں کے سپرد کرتے جو متضاد واقعات میں تطبیق اور بعض خرقِ عادت واقعات کی توجیہ کرسکیں، یا پھر ان کو حذف کردیں، تاکہ موجودہ دور کے مادیت پسندوں کو خواہ مخواہ اہلِ دین سے وحشت نہ ہو، خاص طور پر صوفیہ کے تذکروں میں تو اس کیلیے شدید اہتمام کی ضرورت ہے، یہ ایک مسلم شیخ اور محدث وقت کا مرتب کردہ تذکرہ ہے، مگر اس میں بھی دسیوں خلافِ سنت واقعات یا تو حذف کردینے کے قابل تھے یا پھر انکی توجیہ کی ضرورت تھی، امید ہے کہ دوسری اشاعت میں اسکی تلافی کی کوشش کیجائیگی، ان باتوں سے قطع نظر اس کا ترجمہ اور اشاعت بہرحال ایک مفید کام ہے۔

م - ج

جلد ۹۸ ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء عدد ۴

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

تقریباً ڈیڑھ سال سے پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کی تجارت بالکل بند ہے، عام اقتصادی حالات کی وجہ سے ہندوستان کی تجارت بھی بہت گھٹ گئی ہے اور اب اس کی آمدنی مشکل سے ایک تہائی رہ گئی ہے، ان حالات میں دار المصنفین کا چلنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے، دوسرا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کی طلب بدستور قائم ہے، اس کی کئی کتابیں وہاں کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں، اس لیے پاکستان کے تاجرانِ کتب نے یہ کتابیں چھپوانا شروع کر دی ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ آیندہ جب پاکستان کی تجارت کھلے گی بھی تو وہاں کا بازار دار المصنفین کے ہاتھ سے نکل جائیگا،

اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے پہلی اور دوسری اکتوبر کو دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا جس میں باہر کے ممبروں میں ڈاکٹر سید محمود صاحب، مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا محمد عمران خاں ندوی سابق مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمد اویس نگرامی استاد تفسیر دار العلوم، سید شہاب الدین دسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے شرکت کی، غور و فکر کے بعد مجلس نے طے کیا کہ دار المصنفین کی مالی حالت کو مستحکم کرنے کے لیے کم سے کم پانچ لاکھ کا سرمایہ جمع کیا جائے جس کو محفوظ کر دیا جائے، صرف اسکی آمدنی صرف میں لائی جائے، اس سرمایہ کی فراہمی کے لیے پورے ملک میں دار المصنفین کے معاونین کا حلقہ بنایا جائے جس میں تین قسم کی رکنیت رکھی جائے، (۱) ایک ہزار روپیے یا اس سے زیادہ یکمشت دینے والے ارکان، (۲) پانچ سو یکمشت دینے والے (۳) ایک سو روپئے سالانہ دس سال تک دینے والے، کتابی شکل میں اس کے معاوضہ کے اصول زیر غور ہیں

اس مقصد کے حصول کے لیے حسب ذیل ارکان کی ایک کمیٹی بنا لی گئی ہے (۱) ڈاکٹر سید محمود صاحب (۲) مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (۳) مولانا محمد عمران خاں (۴) منشی عبد العزیز صاحب انصاری بمبئی (۵) سید شہاب الدین دسنوی بمبئی (۶) جسٹس بشیر سعید احمد صاحب مدراس (۷) مولوی حبیب الرحمن صاحب حیدر آباد (۸) ناظم دار المصنفین (۹) اور شریک ناظم، یہ کمیٹی ملک کے مختلف حصوں میں معاونین بنانے کیلئے وقتاً فوقتاً دورہ کرے گی.

دار المصنفین کی پچاس سالہ خدمات ملک کے سامنے ہیں، اور ہم کو اس کی خوشی ہے کہ اہل علم نے ہمیشہ ان کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کا اعتراف کیا، دار المصنفین نے جس زمانہ اور جن حالات میں اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت کی جو خدمت کی اور دوسرے جو دینی اور علمی کام انجام دیے، آج کے حالات میں پہلے سے زیادہ ان کی ضرورت ہے، اس لیے ہم کو امید ہے کہ ملک کے اصحاب علم اور اس کا صاحب استطاعت طبقہ اس تحریک کا خیر مقدم کرے گا، پانچ لاکھ رقم اتنی بڑی نہیں ہے کہ اس کو مسلمان مہیا نہ کر سکیں،

دوسری درخواست پاکستان کے پریس اور وہاں کے اصحاب علم و قلم سے ہے، اس سے پہلے جب پاکستان کے ناشروں نے دار المصنفین کی کوئی کتاب چھاپی تو وہاں کے اخبارات و اہل قلم نے اسکی پر زور مخالفت کی اور پوری قوت سے اس کو روکا، اسلیے ہم کو امید ہے کہ ان حالات میں جبکہ دار المصنفین بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے وہ پاکستانی ناشروں کو دار المصنفین کی کتابوں کی طبع و اشاعت سے روکنے کی کوشش کریگا،

جنرل الیکشن کی قربت کی وجہ سے مرکزی حکومت نے مسلمانوں کی بعض فوری اور اہم شکایتوں کو دور کرنے کی طرف توجہ کی ہے، اس وقت سب سے بڑے مسئلے دو ہیں، مسلم یونیورسٹی اور اردو کا تحفظ، نواب علی یاور جنگ یونیورسٹی کے معاملات پر مسلمان زعماء سے گفتگو کرنے کیلئے لکھنؤ آئے تھے، مگر وہ ان کو مطمئن نہ کر سکے اور ان کی گفتگو کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا، مرکزی وزیر فخر الدین علی احمد صاحب نے بھی دونوں مسئلوں پر صوبائی حکومت اور بعض مسلمانوں سے گفتگو کی، مگر وہ بھی کوئی فوری اور قابلِ اطمینان حل نہ پیش کر سکے۔

درحقیقت مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں مسلمان اسی وقت مطمئن ہوں گے جب یونیورسٹی کو وائس چانسلر صاحب کے آمرانہ اختیارات سے آزاد کیا جائے اور وہاں کے طلبہ سکون و اطمینان کا سانس لے سکیں، یونیورسٹی کے احاطہ سے پولیس ہٹا لیجائے اور ماخوذ طلبہ کے مقدمات اٹھا لیے جائیں، یہ تو عارضی اور فوری حل ہے، اس کے بعد جلد سے جلد ایسا ایکٹ بنایا جائے جس میں یونیورسٹی کی آزادی اور اس کی خصوصیات پوری طرح قائم رہیں۔

اردو کا مسئلہ تحقیقاتی کمیٹی سے حل نہیں ہوگا جس کا برسوں سے تجربہ ہو رہا ہے، اس کے حل کی صورت صرف یہ ہے کہ مختلف ریاستوں خصوصاً دلی، اتر پردیش اور بہار کے بارہ میں اردو والوں کا مطالبہ پورا کیا جائے، ان ریاستوں میں قانونی حیثیت سے یعنی صدر جمہوریہ کے حکم یا اسمبلی کے قانون کے ذریعہ اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے اس کے علاوہ جو شکل بھی اختیار کیجائے گی اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا اور نہ مسلمان اس سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔

ان سطور کی تحریر کے بعد معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے بارہ میں حکومت مطالبات ماننے کیلئے آمادہ ہو گئی ہے، اور جلد ہی ان پر عمل شروع ہو جائیگا، دیر سے سہی مگر حکومت نے انکو مان کر سمجھداری کا ثبوت دیا، کاش اردو کے معاملہ میں بھی اسی دانشمندی کا ثبوت دیتی تو مسلمانوں کی دو بڑی اہم شکایتیں دور ہو جاتیں۔

مقالات

سولھویں اور سترھویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

(۳)

مصنف نے شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیم صاحب کو بھی دارا شکوہ کی صف میں لاکھڑا کر دیا ہے، اس لیے کہ وہ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے، ہاں وہ ضرور وحدت الوجود کے ماننے والے تھے، لیکن اس وحدت الوجود کے حامی نہ تھے جو مصنف کے ذہن میں ہے، شاہ عبد الرحیم فضل و کمال اور صلاح و تقوی کے ایسے مکمل نمونہ تھے کہ اگر مصنف نے ان کا واقعی مطالعہ کیا ہوتا تو پھر ان کو احیائے اسلام کے علمبرداروں ہی میں شامل کرنا پڑتا، وہ جب خواجہ خرد نقشبندی سے بیعت ہونا چاہتے تھے تو خواجہ خرد نے فرمایا کہ میں اتباع سنت میں کچھ متساہل ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تمہارا قدم جادۂ شریعت سے الگ ہو جائے، انفاس العارفین کی عبارت یہ ہے :-

"فرمودند غرض آنست کہ بعض امور ممنوعہ مرتکبم و در اتباع سنت قدرے تساہل دارم، مبادا قدم شما بواسطۂ ارتباط بیعت از جادۂ شرع بجنبد" (ص ۵)

پھر خواجہ خرد ہی کے مشورہ سے شاہ عبد الرحیم شیخ آدم بنوری کے ایک خلیفہ سید عبد اللہ سے بیعت ہوئے، شیخ آدم بنوری حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ تھے، شیخ آدم بنوری کے خلفاء کے بارہ میں خواجہ خرد کا یہ خیال تھا :

"ایشان در تشرع و ترک دنیا و تہذیب نفس قدمے دارند کہ دیگراں را میسر نیست"۔ (انفاس العارفین ص)

حضرت سید عبد اللہ کی وفات کے بعد شاہ عبد الرحیم خلیفہ ابو القاسم اکبرآبادی سے فیوض اٹھاتے رہے، جو بڑے متبع شریعت تھے، ان ہی بزرگان دین کے فیوض سے شاہ عبد الرحیم متبع شریعت کے پرواز بنے رہے، ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں:

"در ہمہ حال متبع آثار نبوی می نمودند یکے از آثار استقامت ایشان آں بود کہ گاہے در عمر خود جماعت فوت نکردہ بودند الابعذر بزرگان گفتہ اند الاستقامۃ خیر من الکرامۃ و ہیچ حال نہ در جوانی و نہ در صبا میل بامور ممنوعہ نداشتند، اتباع جادۂ محمدیہ خلق جبلی ایشاں بود۔" (انفاس العارفین ص ۸۶-۸۵)

عاشق رسول ہونے کی وجہ سے ہر مشکل میں آپ ہی کا وسیلہ ڈھونڈتے کسی اور کے وسیلہ کو ناجائز سمجھتے، اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"وہر چہ مشکل افتد مدد از روحانیت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم باید خواست و از غیر حبیب خدا کسے دیگر رجوع نباید کرد۔" (مکتوبات ص ۴۸)

اسی کے ساتھ وہ وحدت الوجود کے بھی قائل تھے، انفاس العارفین میں ہے کہ وہ فرماتے

"اگر خواہم نصوص را بر سر منبر تقریر کنم و جمیع مسائل آں را بآیات و حدیث مبرہن سازم و بوجہے بیان نمایم کہ ہیچ کس را شبہ نماند۔" (انفاس ص ۸۲)

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کا قائل ہونا اور شریعت کا پابند رہنا دو متضاد چیزیں نہیں ہیں جیسا کہ ہمارے مصنف نے اپنے ناظرین کو غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی، یہ بالکل ذوقی اور وجدانی چیز ہے جس میں جادۂ اعتدال سے ہٹ کر ورطۂ ضلالت میں پڑ جانے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے، اسی لیے شاہ عبد الرحیم جہاں وحدت الوجود کی طرف مائل تھے، وہاں اس کی تشریح سے گریز کرتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

"از تصریح بوحدت وجود احتراز می نمودند کہ غالب اہل زبان از ان فہم نمی توانند کرد و در ورطۂ الحاد و زندقہ می فتند۔" (انفاس العارفین ص ۸۲)

اور اس کو تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں کہ شاہ عبد الرحیم اور ان کے خاندان والوں کے فیوض و برکات سے آج ہندوستان میں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں گونج رہی ہیں، اور ہمارے مصنف کو یہ جاننے کے بعد شاید دکھ ہو کہ شاہ عبد الرحیم کو فیض بڑی حد تک حضرت مجدد الف ثانی کے خلفاء کے سلسلہ ہی سے پہنچا کیونکہ پہلے ذکر آیا ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ شیخ آدم بنوری کے خلیفہ سید عبد اللہ کے مرید تھے،

شاہ عبد الرحیم نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد سے بھی مذہبی اور روحانی فیوض حاصل کیے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خواجہ خرد میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جن کو شاہ عبد الرحیم پسند فرماتے تھے، خود ہمارے مصنف نے لکھا ہے کہ خواجہ خرد ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتے، جو شریعت سے غفلت برتنے کی کوشش کرتے اور اس کو ثانوی درجہ دیتے (ص ۳۳۴) لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ توحید وجودی کے اور حامیوں کی طرح مختلف لوگوں اور طبقات (Sections) کے اختلافات اور جھگڑوں کے ختم کرنے پر زور دیتے، اور صلح پسند از بقائے باہم Peaceful co-existence اور ہم آہنگ طرز بود و ماند (Harmonious living) کے نصب العین کے نشو و نما میں اعانت کرتے، اگر کوئی ان کی تضحیک کرتا تو وہ اپنے دشمن کی تنقید نہ کرتے، یہی کریم النفسی کی اسپرٹ اپنے مریدوں میں بھی پیدا کرتے رہتے، شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبد الرحیم کیچڑ میں پڑے ہوئے ایک کتے کو بچانے اور دیکھ بھال کرنے میں مطلق نہیں ہچکچاتے (ص ۳۴۴) مصنف نے "صلح پسند از بقائے باہم اور ہم آہنگ طرز بود و ماند" کے نصب العین کو نشو و نما دینے اور کریم النفسی پیدا کرنے کے سلسلے میں کتے کو بچانے اور دیکھ بھال کرنے کی مثال اچھی پیش کی ہے، مصنف سیاق و سباق

حذف کرکے اپنے مطلب کی بات نکالنے میں ماہر ہیں، اگر کتے کو بچانے کی پوری روایت کو وہ غور سے پڑھتے تو شاہ عبدالرحیم صاحب سے بھی ان کو جھنجھلاہٹ پیدا ہوجاتی ، وہ کتا دراصل کتا نہ تھا، بلکہ ایک مردِ غیبی تھا، جو کتے کی شکل میں نمودار ہوا، اور شاہ عبدالرحیم کو فخر وغرور اور خود بینی کی ناپاکی اور درویشانہ ایثار و اختیار اور عقلِ مقدس اور عقلِ مظلم کی تفریق بتا کر ان کو تعلیم و تلقین کی۔

کتے کی روایت کسی سلسلے میں لکھی گئی ہے، لیکن ہمارے مصنف نے اس سے فائدہ اٹھا کر صرف اپنے ممتحنوں کو بلکہ اپنی کتاب کے ناظرین کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے، اور اگر کتے کی دیکھ بھال کرنا حضرت خرد جیسے وحدت الوجود کے حامی کی تربیت کا نتیجہ تھا تو شاہ عبدالرحیم کا سختی سے پابند شریعت ہونا بھی حضرت خرد ہی کا فیضان کہا جاسکتا ہے، پھر ان دونوں بزرگانِ دین میں وہ وحدت الوجود کہاں ہے جس کے حامی ہمارے مصنف ہیں، وہ میاں میر کو وحدت الوجود کا علمبردار بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اور ان کے مریدین موحدوں اور وحدت الوجودیوں کی طرح مذہب کے ظاہری رسوم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن اس فقرے کے ساتھ یہ بھی لکھ گئے ہیں، اگرچہ میاں میر اور ان کے بعض مریدین شریعت کے احکام کی تقلید بہت حزم واحتیاط کے ساتھ کرتے، شریعت کو وہ طریقت کا پہلا زینہ سمجھتے، پھر میاں میر ہی کے سلسلہ میں وحدت الوجود کے حامیوں کے متعلق یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ مومنوں اور کافروں، جنت اور دوزخ، ثواب اور عذاب میں تفریق ان کے نزدیک ایک بیہودہ چیز تھی، جن کی طرف توجہ اور لگاؤ ناواقفوں ہی کو ہوتی ہے۔ (ص ۳۴۲)

کیا اسی مسلک کے قائل حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ امان پانی پتی اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ عبداللہ، خواجہ خرد، پھر شاہ عبدالرحیم اور شاہ محب اللہ الہ آبادی تھے، ناظرین خود فیصلہ کریں۔

مصنف رقمطراز ہیں کہ سرمد نے جن رباعیوں میں علماء اور صوفیہ کی رسمی عبادتوں اور مواعظ کا مذاق اڑایا ہے، وہ شاہجہانی عہد میں ہر مسلمان کے گھر میں مقبول تھیں، مصنف کے حوالہ جات کے بے پناہ ڈھیر سے

پتہ نہ چل سکا کہ ان کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ رباعیاں شاہجہانی عہد میں ہر مسلمان گھر میں مقبول تھیں، سرمد کی رباعیاں پڑھتے اور سنتے وقت ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے کہ معلوم نہیں یہ ان ہی کی ہیں یا ان سے منسوب ہیں، مصنف نے جن رباعیوں کے انگریزی ترجمے نقل کیے ہیں وہ بعض انگریزی کتابوں سے مستعار ہیں، مصنف کی اعلیٰ علمی لیاقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اصل بھی لکھتے اور خود اس کا انگریزی ترجمہ کرتے لیکن ان کو تو ایک بات کہنی تھی، اس لیے وہ جہاں سے بھی حاصل ہوگئی، مقالہ میں لکھ کر بات پوری کردی، میرے سامنے سرمد کی رباعیوں کا جو نسخہ ہے، اس میں وہ رباعیاں نہیں ہیں، اگر حضرت سرمد کی اسی قسم کی رباعیوں سے استدلال کرنے کی ضرورت ہو اور ان سے لفظی معنی لینا ہے تو پھر ان کے حسب ذیل اشعار کے متعلق کیا خیال ہے:

بت پرستم کافرم از اہل ایماں نیستم   سوئے مسجد می روم اما مسلماں نیستم

ہر کس کہ زمے توبہ کند ناداں است   انساں نتواں گفت بگو حیواں است

ایں سلسلہ جنباں غمِ جاناں است   ہر آتشِ افسردہ دلی داماں است

اے دوست دریں میکدہ بے یار مباش   بے ساقی گلعذار زنہار مباش

ایں جام جہاں نما بہر کس ندہند   غافل تو ازیں دولت بیدار مباش

ان اشعار کے تو بظاہر یہی معنی ہیں کہ حضرت سرمد (خدانخواستہ) مسلمان نہ تھے، اور وہ ایسے شخص کو جو شراب نہیں پیتا ہے، حیوان سمجھتے تھے، اور وہ میکدہ میں معشوق اور ساقی گلعذار کے ساتھ رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ وحدت الوجود کے علمبرداروں کا یہی شیوہ اور مسلک رہا تو ایسے ہی وحدت الوجود سے بعض بزرگانِ دین کو وحشت رہی، لیکن حضرت سرمد کی رباعیوں کے ظاہری معانی و مطالب پر جانا اور ان سے استدلال کرنا ان کی عارفانہ شان کے ساتھ زیادتی کرنا اور اپنی کور نظری کا ثبوت دینا ہے،

مصنف نے بکرما جیت حسرت کی کتاب "دارا شکوہ اس کے سوانح حیات اور تصانیف" کے حوالے سے بتایا ہے کہ دارا شکوہ ملاؤں کا خوب مذاق اڑایا کرتا تھا (ص ۳۴۵ - ۴۶) اس تضحیک میں

کیا شاہ محب اللہ الہ آبادی بھی شریک ہو سکتے تھے؟ یا دارا شکوہ نے سرِ اکبر کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ کلامِ پاک یعنی انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسه الا المطهرون تنزیل من رب العلمین کا اشارہ اپنشدوں کی طرف ہے، جو بحرِ توحید کا سرچشمہ ہے، قدیم ہے، اور قرآن مجید کی آیت کی تفسیر ہے، کیا خواجہ باقی باللہ کے دونوں صاحبزادے خواجہ عبداللہ اور خواجہ خرد اور شاہ عبدالرحیم صاحب اس سے متفق تھے؟ اور کیا یہ بزرگانِ دین دارا شکوہ کی اس رباعی کے ہم خیال تھے۔

کافر گفتی تو از پے آزارم | من حرف ترا راست ہمی پندارم
پستی و بلندی ہمہ شد ہموارم | من مذہب ہفتاد و دو ملت دارم

اور کیا یہ بزرگانِ دین بھی دارا شکوہ کی طرح لٹِ بسنٹ کے بھی معتقد تھے؟

مصنف نے بڑے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ سترہویں صدی میں ملا شاہ (یعنی دارا شکوہ کے مرشد) سے مسلمان زیادہ متاثر رہے (ص ۳،۵) مصنف مراۃ الخیال کو ایک مستند ماخذ سمجھتے ہیں، اور اسکے حوالے اپنی کتاب میں شوق سے دیے ہیں، اسی مراۃ الخیال میں ملا شاہ کی تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے،

ایک روز ملا شاہ لاہور میں عربی گھوڑے پر سوار تھے، وہ زربافت نیم آستین بوم طلا پہنے ہوئے تھے، میاں شاہ میر کے ایک خلیفہ ملا خواجہ بھی تھے، وہ بہت ہی تجرید کی زندگی گذارتے تھے، وہ ملا شاہ کے حجرے سے گذرے تو سلام کی سنت ادا کرنے کے لیے آئے، لیکن جب ان کی نظر نیم آستین پر پڑی تو ان کا مزاج بہت تلخ ہو گیا، ملا شاہ کا دامن پکڑ کر کہا یہ کیا چیز ہے، ملا شاہ نے نگاہ ڈالی اور پھر کہا ملا خواجہ واللہ میں نہیں جانتا ہوں کہ مجھ پر لوگوں نے کیا ڈال دیا ہے۔ ان اوراق کے مولف کے لیے مقامِ عبرت ہے کہ ملا شاہ کو سب کمالات کے باوجود جھوٹی قسم کھانے کا احساس بھی نہ رہ گیا تھا، اس قسم کے لباس کو گھر میں رکھنا، ان کو استعمال کرنا اور اس سے بے خبر رہنا محلِ تعجب ہے، یہی وجہ ہے کہ شروع میں حضرت میاں شاہ میر نے انکی تربیت میں تغافل کو راہ دیا ہوگا، کیونکہ ان میں دنیا سے تعلق رکھنے کا رنگ پایا جاتا تھا (مراۃ الخیال فارسی

اس روایت کے بعد ملا شاہ کی جو سیرت سامنے آتی ہے، اس کو مصنف نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے، اور اسی ماخذ سے اپنے مطلب کی دوسری باتیں بلا تکلف لے لی ہیں، اسی مراۃ الخیال میں ہے کہ ملا شاہ نے اورنگزیب کی تخت نشینی پر یہ رباعی لکھ کر اورنگزیب کے پاس بھیجی

صبحِ دلِ من چوں گلِ خورشید شگفت | حق ظاہر شد غبارِ باطل را رُفت
تاریخ جلوس شاہ اورنگ مرا | ظل الحق گفت الحق ایں راحق گفت

اب اگر واقعی اس عہد کے مسلمان ملا شاہ سے متاثر تھے، تو وہ بھی ملا شاہ کی طرح خوش ہوں گے کہ اورنگزیب کی تخت نشینی سے حق ظاہر ہوا، اور غبارِ باطل جاتا رہا، اور اورنگزیب واقعی ظل الحق تھا، مصنف اگر واقعی ملا شاہ کے معتقد ہیں تو پھر اس رباعی کے بعد ان کو بھی اورنگزیب کا معتقد ہونا چاہیے، یا نہیں تو پھر ملا شاہ کو بھی اپنے تیرِ ملامت کا ہدف بنائیں، پھر مصنف نے مراۃ الخیال سے جہاں بہت سے اقتباسات لیے ہیں، وہاں مراۃ الخیال کے مصنف کی اس رائے کے متعلق ان کا کیا خیال ہے کہ دارا شکوہ نے سرمد کی صحبت اس لیے اختیار کی کہ وہ مجانین کی طرف زیادہ مائل تھا، لیکن جب اورنگزیب کا زمانہ آیا تو خدا پرستی کا غلغلہ ہوا، اکبری و جہانگیری رسوم کا خاتمہ ہوا، مراد بخشی اور دارا شکوہی بدعتیں ختم ہو گئیں، حضرت سرمد کے ذکر کے سلسلہ میں مراۃ الخیال کے مصنف کا بیان ہے

"چوں خاطرِ سلطان دارا شکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت بادے درگرفت و مدتے با ترغیبات او سرخوش بود تا آنکہ روزگار طرح دیگر انداخت و در سنہ ہزار و شصت و نہ اورنگ خلافت و جہانداری بوجود فیض آمود ابو المظفر محی الدین محمد اورنگزیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ مزین گردید و آوازہ خدا پرستی جہاں را فرو گرفت و رسوم اکبری و جہانگیری بر افتاد و بدعت ہائے مراد بخشی و دارا شکوہی یک سو شد۔" (ص ۲۱۶)

مصنف کی نظر مراۃ الخیال کی مذکورہ بالا عبارت پر نہیں پڑی، ورنہ مراۃ الخیال کے مصنف کی عزت

دائرہ کے بھی لالے پڑ جاتے، مصنف کی رائے کے مطابق اگر ملا شاہ اور دارا شکوہ وحدت الوجود کے حامی ہونے کی وجہ سے کفر و ایمان کی تفریق مٹا دینا چاہتے تھے، تو دارا شکوہ اپنے پیر ملا شاہ کے متعلق یہ کیا لکھ گیا ہے، مصنف غور سے پڑھیں

"اردگرد کے ممالک خصوصاً کشمیر میں آپ کو قبولیت عظیم حاصل ہے، چنانچہ کشمیر کے رافضی اور کافر صرف آپ کے دروازے سے گذرتے ہی بے اختیار آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے، اور کفر کو چھوڑ کر مذہب اسلام قبول کیا اور اہل سنت و جماعت کا مذہب اختیار کیا، کشمیر میں یہ بھی مشہور ہے کہ جو بدعتی آپ کے دروازے سے گذرتا، اسے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دکھائی دیتے، اس آزمائش کے لیے اکثر رافضی آپ کے دروازے کے پاس سے گذرتے تھے"۔ (یہ اقتباس سکینۃ الاولیاء کے اردو ترجمہ ص ۱۲۳ سے لیا گیا ہے، کیونکہ فارسی نسخہ اس وقت سامنے نہیں ہے) دارا شکوہ کی مذکورہ بالا روایت کی صحت و عدم صحت کا تجزیہ کرنا تو ہم مصنف کے لیے چھوڑتے ہیں لیکن رافضی، کافر، کفر، اسلام، اہل سنت و جماعت، بدعتی جیسے الفاظ شہادت دے رہے ہیں کہ دارا اور اسکے مرشد بھی اس تفریق کے قائل رہے،

مصنف سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ جب ان کے پاس ماخذوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا تو ان سے براہ راست استفادہ کرنے کے بجائے بکرما جیت حسرت کی "دارا شکوہ: حالات زندگی اور تصانیف" اور قانون گو کی "دارا شکوہ" جیسے ثانوی ماخذوں کا سہارا کیوں لیا، (ص ۵۰ - ۳۴۹) ان کے جیسے بلند دعاوی کرنے والے محقق کے لیے یہ زیبا نہ تھا،

مصنف نے مرآۃ الاسرار کے مصنف مولانا عبد الرحمن کو ردولی کے مخدوم حضرت عبد الحق کی اولاد بتایا ہے (ص ۳۵۴) جو بالکل صحیح نہیں، مصنف کا یہ لکھنا صحیح نہیں کہ مولانا عبد الرحمن حضرت شیخ عبد الحق ردولوی کی نسل سے تھے، ان کی غلطی اس لیے ہوئی کہ وہ اپنی تحقیقات کے بلند دعوی کے باوجود بلا تکلف ثانوی ماخذوں پر اعتماد کر لیتے ہیں، برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کے کیٹلاگر نے عبد الرحمن چشتی کا جو نسب نامہ اپنی فہرست

جلد اول ص ۳۵۹ پر لکھ دیا ہے، اسی کو مصنف نے نقل کرنے پر اکتفا کی ہے، حالانکہ ان کے حواشی سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مرآۃ الاسرار کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اگر وہ واقعی اس تذکرہ کا گہرا مطالعہ کرتے تو برٹش میوزیم کے کیٹلاگر کے بیان پر بھروسہ کر کے اپنے ناظرین کو غلط قسم کی معلومات فراہم نہ کرتے، مرآۃ الاسرار کے مصنف نے اپنا نسب نامہ یہ لکھا ہے:

"کاتب الحروف حضر الفقیر عبد الرحمن چشتی بن عبد الرسول بن قاسم بن شاہ بدہ بن میاں شیخ بن دانیال ثانی بن بدر الدین بن معین الدین بن قطب بن فرید بن نظام بن نصیر الدین بن دانیال عرف مولانا عود بن میر بدر الدین ابن حسن بن فضل ثالث بن عبد اللہ بن عباس ثانی بن یحیی بن فضل ثانی بن محمد بن فضل بن حسن بن عبد اللہ بن عباس بن علی مرتضی (ص ۵۰۹ قلمی نسخہ دار المصنفین)

اس نسب نامہ سے کہیں پتہ نہیں چلتا ہے کہ مولانا عبد الرحمن شیخ احمد عبد الحق ردولوی کی نسل سے تھے، اسی مرآۃ الاسرار میں ہے کہ مولانا عبد الرحمن حضرت شیخ عبد الحق کے پرپوتے شیخ حمید کے مرید اور خلیفۂ مجاز تھے (ص ۱۰۱) لیکن مصنف ان کو شیخ عبد الحق کے سلسلہ کے بجائے ان کو اولاد اس لیے بتا گئے ہیں کہ برٹش میوزیم کے کیٹلاگر نے ان کو ایسا ہی بتایا ہے، (۳۵۹)

مصنف کی نوک سوزن اور خلش خار سے بھری ہوئی تحریروں کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین نہ کرامات تھے اور نہ مبلغ اسلام تھے، خواجہ نظام الدین اولیا، اقتدار پسند تھے (ص ۱۹) حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی بد اخلاق (Immoral) اور بد پرہیزگار (Impious) تھے (ص ۱۲) حضرت جلال الدین تبریزی زنا کے ملزم تھے (ص ۲۴) شیخ علی متقی گجرات کے ایک وزیر کی بیوہ ماں سے نکاح کے خواہاں ہوئے (ص ۱۴۲) خواجہ باقی باللہ نے ایک حسین لڑکی سے ناکام عشق کیا (ص ۱۸۵) عبد الحق محدث دہلوی میں چمڑے سے بندھا ہوا تعصب تھا (ص ۱۵۱) حضرت مجدد الف ثانی نہیں بلکہ صرف مجدد فرقہ واریت کے علمبردار اور ایک متعصب ملا تھے۔ اسی طرح

ان کے نزدیک زیادہ تر صوفیہ اور صلحا ذہنی بحران میں مبتلا رہے، ان تمام ارشادات کے پڑھنے کے بعد تو پھر یہی کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ اور سچے قسم کے مسلمان صرف ڈاکٹر اطہر عباس رضوی ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، آف آر، اس مصنف مغل کالین بھارت ہی ہیں، جن کو وشنوازم بہت پسند ہے (۶۰، ۶۱، ۲۱۳) وہ بھگتی تحریک اور فلسفۂ ویدانت کے بھی مداح ہیں (ص ۶۶) یوگ اور ادادیتا کے پرستاروں کے حامی ہیں، اکبر کی رواداری، وسیع المشربی اور صلح کل کی پالیسی کے ثناخواں ہیں (ص ۱۵۶) جن مسلمان مصنفوں نے یوگ (ص ۲۸) پر جو کچھ لکھا ہے یا ہندوازم اور اسلام کو ایک سطح پر رکھنے کی کوشش کی ہے، ان سے بھی بہت خوش ہیں (ص ۷۱ - ۳۵۶) گرو ارجن دیو سے مسلمانوں کی عقیدت کامل پر بھی خوشی کا اظہار کرتے ہیں (ص ۲۱۳) وہ مذہب کو جس سے انکی مراد اسلام ہی ہوتی ہے، ظالمانہ ایذارسانی اور ہندوستان کے مختلف باشندوں کے درمیان تعلقات کی خرابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں (ص ۲۱۴) وہ ایسے علماء، صوفیہ، اور صلحا کو پسند نہیں کرتے ہیں جنھوں نے راسخ العقیدگی اور شریعت کی پابندی پر زور دیا، وہ اگر راسخ العقیدگی (Orthodoxy) کے مخالف ہیں تو گویا بدعقیدگی (hetrodoxy) کے ذریعہ ہی اسلام کی اصلی خدمت سمجھتے ہیں، ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے وہ راسخ العقیدگی اور بدعقیدگی، خیر و شر، صداقت اور ضلالت، کفر و اسلام میں تفریق پیدا کرنے کے قائل نہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اس قسم کی تفریق ہی کو مٹاکر صلح کل اور بقائے باہم کی فضا قائم کیجا سکتی ہے، مصنف مہدویت کو احیائے اسلام کی ایک تحریک ثابت کرنے میں اپنے کو کامیاب سمجھتے ہیں، اسی طرح کیا عجب کہ مصنف کی اس کتاب کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد ڈی لٹ کا کوئی طالب علم اپنے زور بیان سے اطہر عباسیت کو بھی احیائے اسلام کی ایک تحریک ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے، کیونکہ اس میں اسلامی تعلیمات، اسلامی تصوف اور وحدت الوجود کے جو تخیلات پیش کیے گئے ہیں، وہ نہ صرف نئے اور اچھوتے ہیں، بلکہ ان سے مسجدوں، مذہبی مدرسوں اور خانقاہوں میں تو نہیں لیکن پارکوں، سینما گھروں

قہوہ خانوں، کانفرنسوں اور مستشرقین کی مجلسوں میں بیٹھ کر بحث کرنے والوں کو اسلام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

ان کا استدلالی رنگ بھی عجیب و غریب ہوتا ہے، کسی تذکرے میں کوئی بات انکی مرضی کے خلاف ملتی ہے تو وہ فوراً اس کی تردید یہ لکھ کر کرتے ہیں کہ تاریخ کی کتابوں میں اس کی شہادت نہیں ملتی (ص ۴۲) اور اگر کوئی بات کسی تاریخ میں ان کے مطلب کی ہوتی ہے تو وہ یہ لکھکر اپنے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تو کسی معاصر تاریخ میں نہیں، اور وہی بات معاصر تاریخ میں مل جاتی ہے تو لکھتے ہیں کہ یہ تو ضرورت سے زیادہ پرجوش مسلمان معاصر مورخوں کے محض تحسین آمیز بیانات ہیں (ص ۳۹۰) اور جب کسی واقعہ کی شہادتوں کے ڈھیر سے پریشان ہو جاتے ہیں تو فرماتے ہیں اس واقعہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے (ص ۳۹۲) اور کوئی بات ان کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے تو وہ بکرماجیت حسرت (ص ۳۵۲، ۳۵۱، ۳۴۹، ۳۴۶) قانون گو (ص ۴۷، ۴۰ و ۳۵۰) ستیش چندر (ص ۳۹۹) ڈاکٹر نورالحسن (ص ۱۵۵) وغیرہ جیسے مصنفوں اور مقالہ نگاروں اور خود اپنی کتاب مغل کالین بھارت (ص ۱۵۱) کا سہارا لینے میں تامل نہیں کرتے، کہیں اپنی مرضی کے خلاف بات کو جعلی، فرضی اور ناقابل توجہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں (ص ۲۹۴) کبھی کسی روایت کو خیالی (Fantastic) (ص ۳۰۱) معروضیت سے دور (Far from objectivity) ص ۳۰۳ سطحی مشاہدہ (Superficial observation) اکادکا واقعہ (Stray incident) ص ۳۰۳ جعلی (Fabricated) توڑے جوڑے ہوئے تاریخی واقعات (Historical facts twisted) ص ۳۲۲) اور کبھی سطحی (Superficial) ص ۶۶) خرافاتی ص ۱۳۵ اور چمڑے سے بندھا ہوا تعصب (Hide bound prejudice) (ص ۱۵۶) منفی اور ضررساں (ص ۱۷۵) نقصان دہ (ص ۱۷۳) رجعت پسندانہ نصب العین (ص ۲۱۲) غیر محتاط فرقہ وارانہ جنون (ص ۲۱۵) فرقہ وارانہ جذبات (۲۴۷) طویل مواعظ (tirade) ص ۳۱۲

دماغی اور جذباتی توازن کی گمشدگی (ص ۳۱۰) بیہودہ اور ناقص (ص ۳۶۳) بے بنیاد (ص ۳۰۴)
خیالی خوف اور وہمی خطرہ (۳۰۵) ضرورت سے زیادہ زور (ص ۳۹۲) جیسے صحافتی رنگ کے
الفاظ کا سہارا لیکر اپنے مطلب کے نتائج ناظرین کے سر منڈھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور پھر گمراہ کن
طرز استدلال نہیں بلکہ کٹ حجتی سے اپنی باتوں کو منوانا چاہتے ہیں،

مہدویت کی ناکامی کا اصلی سبب یہ بتاتے ہیں کہ اس فرقہ کے خلاف جابرانہ ایذا رسانی ختم ہوگئی
تو یہ تحریک بھی ختم ہوگئی (ص ۲۰۔۱۴۰۔۱۳۳) کیا سطحی بات نہیں؟ مصنف کو یہ لکھنے میں دکھ محسوس ہوا کہ
عام مسلمانوں کو اس تحریک سے کوئی رغبت نہیں ہوئی، اور انھوں نے سید محمد جونپوری کو مہدی موعود
تسلیم نہیں کیا، اس لیے یہ تحریک خود بخود ختم ہوئی، مسلمان عوام کے نزدیک مہدی موعود کی بڑی
شرط یہ ہے کہ وہ قیامت کے قریب زمانہ میں نمودار ہوں گے، سید محمد جونپوری کی پیدائش کو پانچسو
برس گذر گئے لیکن ابتک قیامت نہیں آئی، اس لیے عام مسلمان ان کے دعویٰ کو باطل قرار
دیتے رہے اور اب بھی دیتے ہیں، مصنف کی اس کتاب سے ہر جگہ ظاہر ہے کہ جس چیز کو مسلمانوں کا
جمہور پسند کرتا ہے، اس کو وہ ناپسند کرتے ہیں، اور جس چیز کو عام مسلمان ناپسند کرتے ہیں اس کو وہ
پسند کرتے ہیں، اسی لیے سید محمد جونپوری کے حالات لکھنے میں ان کا قلم بہت ہی نرم اور خوشگوار ہوگیا
ہے، وہ خوش ہوں گے کہ اپنی تحریر سے اپنے ناظرین کو اس کشمکش میں ڈالدیا ہے کہ وہ اگر سید محمد
جونپوری کو تسلیم نہیں کرتے ہیں تو وہ مجدد الف ثانی کو بھی تسلیم نہ کریں، اور اگر سید محمد جونپوری کو
رد کرتے ہیں تو وہ مجدد الف ثانی سے بھی انحراف کریں، مگر عقائد میں مغالطہ آمیز سوفسطائی اور
تدلیسی دلائل کام نہیں دیتے، مانو تو دیوتا اور نہ مانو تو پتھر، حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوب
نمبر ۶۷ اور ۶۸ جلد سوم میں مہدی موعود کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ عام مسلمانوں کے جذبات کی
ترجمانی ہے لیکن مصنف نے ان ہی مشاہیر کی رائے کا حوالہ دیا ہے، جو ان کے مطلب کی تھی،

اسلیے حضرت مجدد الف ثانی کا حوالہ اپنے حاشیہ (ص ۰۰) میں دیکر انکی رائے کو نظر انداز کردیا، گو یہ بھی صحیح نہیں، مصنف نے
حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات جلد سوم کے مکتوب نمبر ۶۷ اور ۶۸ کا حوالہ دیا ہے لیکن جلد سوم کے ان مکتوبات
میں کوئی بات نہیں، البتہ مکتوبات کی جلد دوم کے مکتوب نمبر ۶۷ میں حضرت مجدد الف ثانی لکھتے ہیں کہ احادیث نبوی صلی اللہ
علیہ وسلم میں آیا ہے کہ جب مہدی موعود آئیں گے تو ان کے سر پر ابر ہوگا، اس ابر میں ایک فرشتہ ہوگا،
جو پکار کر کہے گا کہ یہ شخص مہدی ہے، اس کی متابعت کرو، اور دوسری احادیث نقل کرنے
کے بعد حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں، احادیث میں آیا ہے کہ اصحاب کہف حضرت مہدی
کے مددگار ہوں گے، اور حضرت عیسیٰؑ ان کے زمانہ میں نزول فرمائیں گے، اور دجال کے قتل
کرنے میں ان کے ساتھ موافقت کریں گے، حضرت مجدد الف ثانی یہ تمام حدیث نقل کرکے
پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سب علامتیں اور باتیں اس شخص کے زمانہ میں موجود تھیں جس نے اہل ہند
میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مصنف اس کا جواب دیں۔

اس میں شک نہیں کہ سید محمد جونپوری کی دعوت کی ابتدا تبلیغ حق، احیائے شریعت اور قیام
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اعلیٰ مقصد کے ساتھ ہوئی، اگر وہ مہدویت کا دعویٰ نہ کرتے
تو وہ بے شک مجددین میں شامل کیے جاتے لیکن مہدویت کے دعویٰ کے بعد وہ جمہور مسلمانوں
کی نگاہ میں معتوب ہوگئے، پھر مصنف کا بیان ہے کہ سید محمد جونپوری ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوئے
اور ۱۵۰۵ء میں وفات پاگئے، ان کی ساری سرگرمیاں پندرہویں صدی عیسوی میں رہیں،
پھر ان کی تحریک کو سولھویں صدی کی تحریک کیسے کہی جاسکتی ہے، بات یہ ہے کہ مصنف نے
مہدویت پر ایک مضمون جولائی ۱۹۵۰ء کے مڈیول انڈیا کوارٹرلی علی گڑھ میں لکھا تھا، اسکو
ضائع کیوں ہونے دیتے، اس کو بھی تھوڑی سی ترمیم و اضافہ کے ساتھ ڈی لٹ کے مقالہ
کے سر دے مارا، اب پندرہویں صدی لکھتے تو مقالہ کا موضوع ٹھیک نہیں پڑتا، اس لیے

مہدوی دائرے کا ایک باب بڑھا کر، سولہویں صدی کا جواز پیدا کر لیا، ان کی کتاب کے اس باب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح وہ راسخ العقیدگی اور بدعقیدگی کے قائل نہیں، اسی طرح وہ مذہبی فتنہ انگیزی اور مذہبی احیا میں کوئی تفریق کرنا گوارا نہیں کرتے۔

اور اگر یہی بات ہے تو معلوم نہیں مصنف کو اکبر کے دین الٰہی پر کسی قسم کی بحث کرنے میں کیوں حجاب دامن گیر ہوا، حالانکہ سولہویں صدی میں مذہبی سرگرمیوں کا یہ عجیب و غریب نمونہ تھا، مصنف ہی کی طرح پروفیسر مکھن لال چودھری نے تحقیقات کے آسمان و زمین کے قلابے ملا کر دین الٰہی کے تمام اصولوں کو عین قرآنی احکام اور اسلامی تصوف کے مطابق بتایا ہے (دین الٰہی ص ۱۹۵) اس کتاب کی مدح سرائی کرنے میں ڈاکٹر سچدانند نے اس غلو سے تو کام نہیں لیا ہے، جو مصنف کی داد دینے میں پروفیسر حبیب نے لیا ہے، پھر بھی اس کی تعریف میں بڑی تر زبانی کو راہ دیا تھا، اس کو اوریجنل ماخذوں کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ اور اکبر کے دین الٰہی کی استادانہ وضاحت بتایا تھا، لیکن ارباب نظر کی نگاہوں میں یہ کتاب ایک تحقیقاتی اسکینڈل ہی سمجھی گئی، لیکن ہندوستان کی سولہویں اور سترہویں صدی کی تمام مذہبی سرگرمیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش میں مصنف کا دین الٰہی کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا معنی خیز ہے، شاید وہ بھی اسمتھ کی طرح اس کو حماقتوں کا پشتارہ ہی سمجھتے ہوں، لیکن وہ اکبر کی وسیع المشربی اور صلح کل پالیسی کے بڑے ثنا خواں ہیں، پھر اس ثنا خوانی کے سلسلہ میں دین الٰہی پر بحث ضرور کرنی چاہیے تھی، لیکن وہ سمجھتے ہوں گے کہ اس پر بحث کرنے سے مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے، ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کے خلاف جو زہر پھیلایا ہے اس کا تریاق اکبر کی ہر قسم کی مدح سرائی کے باوجود نہ ابوالفضل جیسا جادو نگار انشاء پرداز اور نہ موجودہ دور کے غیر مسلم مورخین پیش کر سکے، اس لیے ہمارے مصنف نے اس بحث میں پڑ کر مصیبت مول لینا پسند نہیں کیا، حالانکہ اس دور کی تجدیدی اور احیائی کوششوں کو سمجھنے کے لیے دین الٰہی کے

ضرر رساں پہلوؤں کو جاننا ضروری ہے،

ملا عبدالقادر بدایونی نے دین الٰہی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کو ایک ملا کا متعصبانہ بیان قرار دیا جاتا ہے، مصنف کو اکبر کی رواداری، وسیع المشربی اور انتخابیت پسندی کو سراہنے کے لیے ملا عبدالقادر کو بھی زد میں لانا چاہیے تھا، مگر وہ سمجھتے تھے کہ ملا عبدالقادر کے بیانات سے دین الٰہی کے خلاف مسلمانوں کا جو ذہن بن چکا ہے، اس کا بدلنا ان کی امکانی کوشش سے باہر ہے، ورنہ وہ اسکو بھی وحدت الوجود کا ایک شاہکار قرار دیدیتے، ملا عبدالقادر کے بیانات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اکبر نامہ کے ان بیانات کو کیسے ناقابل یقین کہا جا سکتا ہے، جن کو ابوالفضل نے اکبر کی خداشناسی کے ثبوت میں پیش کیا ہے، اور جس سے اکبر کے ان مذہبی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے جن کو مصنف انتخابیت پسندی، رواداری اور وسیع المشربی لکھتے لکھتے مطلق نہیں تھکتے، ابوالفضل نے اکبر کے ۲۵ ویں سال جلوس کے واقعات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس نے خداشناسی کی خاطر کچھ ضابطے مقرر کیے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

سال کے بارہ حصے ہیں، اس لیے سچقان آئیل میں چوہے نہ مارے جائیں، ایلان آئیل میں سانپ نہ مارے جائیں، تخاقو آئیل میں مرغ نہ ذبح کیے جائیں، اور نہ وہ لڑائے جائیں، ایت آئیل میں کتے جیسے وفادار جانور سے دوستی کا ثبوت دیا جائے، تنگوز آئیل میں سوروں کو تکلیف نہ پہنچائی جائے جمادی الآخر میں چمڑا نہ استعمال کیا جائے، محرم میں جاندار کو نہ ماریں، الخ الخ (اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۳۳-۳۴)

اکبر کے ان ذاتی رجحانات اور سرکاری احکام کے بعد مسلمانوں میں جو ذہنی انتشار پیدا ہو رہا تھا، اس کو محض مصنف کے خیال کے مطابق وہمی اور خیالی نہیں کہا جا سکتا ہے، ان تمام عوامل کا لازمی نتیجہ ایک مجدد کا پیدا ہونا تھا، اور اگر مصنف کا خیال ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کی ساری سرگرمیاں شورش بے مدعا ہو کر رہ گئی تھیں تو ایک شورش بے مدعا کے لیے ۵۲۴ صفحے کی بے مثال کتاب لکھنے اور تحقیق کرنے کی ضرورت نہ تھی، مصنف کی یہ منفی کوشش مجددیت کے ثبت ہونے کی دلیل ہے،

اگر حضرت مجدد الف ثانی اپنے مقصد میں کامیاب نہ رہتے تو مصنف کو اپنے غصہ اور اشتعال کے اظہار کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

اسی دور میں فرقہ روشنیہ کا بھی مذہبی فتنہ اٹھا، مصنف نے اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ عہد اکبری میں بایزید روشن جالندھری نے مہدویت سے آگے بڑھکر نبوت کا دعوی کیا، اور اپنی کتاب کلام البیان کو کلام الٰہی بتایا، اس نے علماء سے بڑے بڑے مناظرے کیے، اور جس طرح ہمارے مصنف کو یہ غلط فہمی ہے کہ ان سے کوئی بازی نہیں لیجا سکتا، اسی طرح بایزید روشن کا دعوی رہا کہ مناظرے میں علماء اس سے بازی نہیں لیجا سکتے، اور ایک مستقل فرقہ روشنیہ کے نام سے قائم ہوگیا، اکبر نے فوج کشی کر کے جس تشدد کے ساتھ اس فرقہ کی سرگرمیوں کے کچلنے کی کوشش کی ہے وہ ایک مستقل تاریخ ہے، اور عام مسلمان خوش ہیں کہ فرقہ کچل دیا گیا لیکن رواداری اور وسیع المشربی کے حامیوں کو اکبر سے ناخوش ہونا چاہیے کہ اس نے ایک نئے مذہبی فرقہ کو پنپنے نہیں دیا، حالانکہ وہ صلح کل کا حامی رہا، مصنف نے سرورق پر ابو الفضل کے جس شعر کا انگریزی ترجمہ دیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کفر کی روک تھام پسند نہیں کرتا تھا، ابو الفضل جیسا وسیع المشرب مورخ بھی فرقہ روشنیہ کو فرقہ تاریکیاں لکھتا ہے، اکبر کے حامی یہ کہکر اس کی مدافعت کریں گے کہ فرقہ روشنیہ اکبر کی سیاست میں مزاحم ہوا، اس لیے اس نے اس کا قلع قمع کر دیا، یہی بات تو اورنگزیب کے حامی کہتے ہیں کہ جو ہندو راجہ یا شیعی حکمراں اس کی سیاست میں رکاوٹ پیدا کرتے رہے، ان کو اس نے پسپا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ہندو کش، شیعہ دشمن، ظالم اور ستمگر کہلایا، اور مصنف بھی اپنی اس کتاب میں یہی راگ الاپتے ہیں، عالمگیر کی مخالفت میں تاریخی لٹریچر کا ڈھیر کیوں نہ لگا دیا جائے، عام مسلمان اکبر کو عالمگیر پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں، اور اب مسلمان اکبر کی فروگذاشتوں اور خامیوں کو اس لیے نظر انداز کرنے کے لیے تیار ہوگئے ہیں کہ نئی تحقیقات سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے خیالات سے

تائب ہو کر آخر وقت میں ایک راسخ العقیدہ کلمہ گو مسلمان ہوگیا تھا، اور اس کا خاتمہ بالخیر ہوا۔

مصنف نے اپنے عجیب و غریب طرز استدلال سے اورنگزیب کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اس سے معلوم نہیں اورنگزیب کی مضحک تصویر سامنے آتی ہے یا خود مصنف کا انداز تحریر مضحک بن گیا ہے، لکھتے ہیں:

"اورنگزیب کا سختی سے شریعت، پرہیزگاری اور شب بیداری کا پابند ہونے کی وجہ سے اسکو "زندہ پیر" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن نسبتاً اس کا زیادہ میلان وحدت الوجود کی طرف تھا"۔ (ص ۳۰۵)

اس نتیجہ کے لیے جو صغری کبری پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے:-

"جو تصانیف اس کے برابر استعمال میں رہیں وہ شہودیوں یا مجدد یا ان کے مریدوں کی نہ تھیں، بلکہ شیخ شرف الدین یحیی منیری کے مکتوبات کے مجموعے تھے"۔ (ص ۳۰۵)

گویا حضرت مجدد اور شیخ شرف الدین یحیی منیری کی تعلیمات میں بعد المشرقین تھا، یہ نہ مجدد اور نہ فردوسی سلسلہ کے مریدین کہہ سکتے ہیں، بلکہ یہ دعوی مصنف ہی کا ہو سکتا ہے۔

مصنف کی مذکورہ بالا تحریر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اورنگزیب پر حضرت مجدد یا ان کے مریدوں کا کوئی اثر نہ تھا لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت معصوم، عالمگیر کے پاس موقع بموقع جایا کرتے تھے، (ص ۳۹۱) وہ مرآۃ جہاں نما کے مولف کے حوالہ سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ شہنشاہ جو دین کا محافظ تھا ان کا یعنی حضرت معصوم کا مخلصانہ طور پر معتقد تھا، اس لیے ان کو اپنے یہاں متعدد بار بڑی عاجزی سے مدعو کیا، ان سے روحانی ملاقاتیں کرتا، اور بڑی سعادتیں حاصل کیں (ص ۳۹۱) مصنف نے اس کا بھی اقرار کیا ہے کہ حضرت معصوم نے اپنے پانچویں صاحبزادے شیخ سیف الدین کو بادشاہ کے ساتھ رہنے کیلیے بھیجا اور بادشاہ کو متعدد خطوط لکھے، جن میں انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ اورنگزیب کے عہد حکومت میں امن و امان قائم ہے، اور وہ اسلامی روایات کو مقبولیت عام دینے کے لائق ہوگیا ہے (ص ۳۹۱) وہ اس کو بھی لکھتے ہیں کہ حضرت معصوم نے شہنشاہ کی جمعیت باطنی پر اطمینان کا اظہار کیا ہے اور انھوں نے

شہنشاہ کے بہت جلد روحانی مرتبہ حاصل کرنے کی پیشین گوئی بھی کی (ص ۹۲-۳۹۱)

وہ روضۃ القیومیہ کے حوالے سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ محمد معصوم قیومیت کے ۳۴ ویں سال (۱۰۷۵ھ / ۱۶۶۴-۶۵ء) میں اورنگزیب کے پاس شاہ جہاں کی وفات پر تعزیت کرنے گئے، انھوں نے شہنشاہ سے شکایت کی کہ شاہی عہدہ دار جزیہ کی وصولی میں غفلت کر رہے ہیں، اور وہ سوداگروں سے غیر قانونی ٹیکس وصول کرنے میں سختی کرتے ہیں، انھوں نے ۴۵ ویں سال قیومیت (۱۰۷۷ھ / ۱۶۶۶-۶۷ء) میں اپنے لڑکے شیخ سیف الدین کو شہنشاہ کی دینی امور میں رہنمائی کرنے کے لیے مامور کیا، شیخ (یعنی حضرت سیف الدین) نے دہلی کے حلقہ میں داخل ہونے سے پہلے مصوری کے اُن تمام نمونوں اور سونے چاندی کی اُن مورتوں کو علیحدہ کرایا، جن کو دارا شکوہ نے نصب کرایا تھا، ان کے کہنے پر موسیقی بند کر دی گئی، سماع کی مجلس بھی ختم ہو گئی، جو یاد پارینہ بن کر رہ گئی، شہزادہ اعظم کی شادی کے موقع پر کوئی غیر اسلامی رسم ادا نہیں کی گئی........" (ص ۳۹۳)

مصنف یہ سب کچھ لکھنے کو تو لکھ گئے ہیں، لیکن پھر کہتے ہیں کہ مجددیوں نے اورنگزیب پر شیخ محمد معصوم کے صاحبزادے کے اثرات کو ضرورت سے زیادہ دکھایا ہے (ص ۳۹۰) اور اگر مصنف پر یہ الزام رکھا جائے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں مجددیت کے اثرات کو ضرورت سے کم دکھایا ہے تو کیا وہ اس الزام کو تسلیم کر لیں گے؟ اگر نہیں تو پھر وہ کیوں اپنے ناظرین سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ مجددیت کے اثرات کو ضرورت سے زیادہ دکھایا گیا ہے، کیا اس لیے کہ ان کو سوفسطائی اور صحافتی رنگ کی تحریر لکھنی آتی ہے۔

اگر مان لیا جائے کہ مرأۃ جہاں نما اور روضۃ القیومیہ کے بیانات مصنف ہی کے بیانات کی طرح قابل تنقید ہو سکتے ہیں تو حضرت معصوم کے خطوط پر اس قسم کی تنقید کرنا محض بے باکی ہوگی، کیونکہ ان کو لکھتے وقت حضرت معصوم کو کبھی خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ یہ طبع ہو کر عام لوگوں کے ہاتھوں میں

پہنچیں گے، اس لیے جب وہ اپنے صاحبزادے کو یہ لکھتے ہیں کہ

"تم نے بادشاہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے اندر وسعت لطیفہ اخفی، اور اس سے مناسبت تامہ کا پتہ چلتا ہے تو اس بات کے مطالعہ سے خوشی ہوئی، لطیفہ اخفی سب سے بڑا لطیفہ ہے، اس کی ولایت سب ولایات سے اونچی ہے، اس لطیفہ کو خاص سرور کائنات کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے، فقیر بھی بادشاہ کے اندر لطیفہ اخفی کی مناسبت پاتا ہے، والغیب عند اللہ"

(مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ص ۸۹-۲۸۸)

تو اس خط کے پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ عالمگیر مجددیوں کے اثرات سے راہ سلوک کی بہت سی اعلیٰ منزلیں طے کرنے میں لگا ہوا تھا، لیکن مصنف اس کو اس لیے تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ دوسروں کی نہیں سنتے بلکہ اپنی ہی کہتے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں، اور کہنے میں وہی پر فریب طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ایک وکیل جھوٹے مقدمہ کو پیش کرنے میں کرتا ہے یعنی اس کو ایک جھوٹ کی مدافعت میں معلوم نہیں کتنے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

مصنف نے ہم کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اورنگزیب وحدت الوجود کی طرف مائل تھا، تو ہم کو ان کے طرز استدلال کے مطابق یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں راسخ العقیدگی نہ تھی، لیکن وہ اپنے ناظرین کو یہ بھی تسلیم کرانا چاہتے ہیں کہ

"اورنگزیب ایک ایسا حکمراں تھا جو اپنے عقیدہ میں پاکیزہ اور راسخ تھا، اور اس کا مکمل رجحان سنیوں کے عقائد کی طرف تھا، اس معاملہ میں وہ بلاشبہ اس نصب العین کے قریب تھا جو مجدد کا تھا۔" (ص ۴۱۳)

اور جب ناظرین اس کو تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں تو یکایک گل افشانی کرتے ہیں۔

"اورنگزیب ایک سیانے حکمراں اور منظم سلطنت کی حیثیت سے اپنے کسی قانون کی عملیت کو دیکھے بغیر مجدد کے مذہبی تخیلات کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔" (ص ۴۱۷)

وہ اپنے متضاد بیانات کی پروا مطلق نہیں کرتے، وہ جہاں یہ لکھتے ہیں کہ اورنگزیب پر مجددیوں کا کوئی اثر نہ تھا اور

"اورنگزیب کے عہد حکومت کے آغاز ہی میں مجددیوں کی قوت ختم ہو چکی تھی"۔ (ص ۴۲۶)

وہاں یہ بھی لکھ گئے ہیں:

"مجدد کے بعض جانشینوں نے شہنشاہ (اورنگزیب) کی عنایتوں سے آفتاب کی گرم گرم روشنیوں سے خوب گرم ہوئے اور دربار کی سازشوں سے بھی کھیلے"۔ (ص ۴۱۳)

وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ

"شہنشاہ یعنی اورنگزیب کو جو معاملات اس کے موافق نہ ہوئے اس میں وہ شرع کو تختہ کے اوپر سے پھینک ڈالتا"۔ (ص ۳۹۴)

اور پھر یہ بھی لکھ گئے ہیں:

"شہنشاہ کا بڑھتا ہوا رجحان راسخ العقیدگی کی طرف تھا اور اسکی پالیسی بھی کہ ہر شعبہ میں مذہبی پاکیزگی (puritanism) بڑھتی رہے، اسی سبب سے قاضی محتسب اور علما کی قوت بڑھنے لگی"۔ (ص ۳۹۶)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

اورنگزیب کا عہد حکومت سادات، مشائخ اور علما کیلئے ایک نعمت عظیم تھا"۔ (۴۱۰)

لیکن اسی باب میں یہ بھی رقم طراز ہیں کہ

اورنگزیب کی حکومت کے زمانہ میں احیاء پسندوں اور رجعت پسندی کے علمبرداروں کی جتنی مخالفت ہوئی اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ نے ان کے خلاف ایذا رسانی کے جو جو اقدام کیے وہ گذشتہ حکومتوں کے زمانہ سے زیادہ تھے"۔ (ص ۴۱۴)

اور پھر کچھ دیر کے بعد یہ بھی کہہ گئے ہیں:

"اورنگزیب کے عہد میں سادات، مشائخ اور علما کی بڑی سرپرستی ہوئی"۔ (ص ۴۲۶)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اورنگزیب کی پرہیزگاری، راسخ العقیدگی اور قانونی روش اسکی ذاتی اور نجی زندگی تک محدود رہی ..."(ص ۴۰۱)

لیکن آگے چل کر یہ بھی لکھتے ہیں:

"اس شہنشاہ نے مسلم سوسائٹی میں پوری سرگرمی سے ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی"۔ (ص ۴۲۷)

ایک اور موقع پر کہتے ہیں:

"اورنگزیب نے دین متین کو مضبوط کرنے اور شرع سید المرسلین کے ترویج دینے کا نعرہ بلند کیا، جس کی شہرت اس کے عہد کے مورخین نے بڑی گرم جوشی سے دی ہے"...... (ص ۳۶۳)

مصنف کی کتاب میں اس قسم کے بہکے بہکے بیانات کی بکثرت مثالیں ملیں گی جن کی خبر مصنف اور ان کے ممتحنوں کو ہے، مصنف کے بعض الہامی بیانات یہ ہیں:

"ہندی الفاظ اور ہندوؤں کے عبادتی گیت صوفیوں کے لیے اسی طرح تھے جس طرح کہ ان کی سانس تھی"۔ (ص ۳۶۳)

"اس نے (یعنی اورنگزیب نے) راجپوتوں سے قسم کھائی تھی کہ وہ ایک سکولر اور فیض رساں حکمران بنجائے گا، اگر وہ اس کی تخت نشینی میں مدد کریں گے"۔ (۳۶۴)

"جوگیوں کے ملنے ملانے سے اسلامی نفسیات کے مخفی تعبیرات کو اکسا وا ہوا"۔ (ص ۴۱۸)

"محفل سماع میں ہندی شاعری اور گیت کی وجہ سے ہندوؤں کے علم الاساطیر صوفیوں میں مقبول عام ہوئے"۔ (ص ۴۱۹)

"لوگ اورنگزیب کے عہد میں بدعتوں کے خلاف مواعظ سننے کیلیے مطلق تیار نہ ہوتے"۔ (ص ۴۲۷)

"اورنگزیب کے عہد میں وحدت الوجود کی بڑی مقبولیت اسکی عظیم ترین فتح تھی"۔ (ص ۴۲۷)

(باقی آئندہ)

اسلامی علم و حکمت کا یونانی پس منظر

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

اسلام کا ایک مستقل فلسفہ ہے، مگر عام اصطلاح میں "اسلامی فلسفہ" سے مراد وہ یونانی یا نوافلاطونی ارسطاطالیسی نظام فکر ہوتا ہے جو دوسری صدی ہجری سے پہلے پہلوی اور سریانی زبانوں سے اور بعد میں بڑی حد تک براہ راست یونانی اصل سے عربی میں منتقل ہونا شروع ہوا، اور جس کی پانچویں صدی ہجری میں حکیم بو علی سینا نے کچھ دیگر ذرائع سے اور کچھ اپنے فکری اجتہادات سے تجدید کی، یہی ارسطاطالیسی، ابن سینائی فلسفہ پانچویں صدی کے بعد مسلمانوں میں "فلسفہ" کے نام سے متداول ہوا، اور آج بھی جبکہ اسلامی ثقافت انتہائی اضمحلال اور زبوں حالی کے دور سے گزر رہی ہے، عربی مدارس میں داخل درس ہے۔

اس فلسفہ کی اصل "ارسطاطالیسی فلسفہ" ہے، چنانچہ امام غزالی نے جب فلسفہ کے رد کے لیے "تہافت الفلاسفہ" لکھنے کا ارادہ کیا تو یونان کے مختلف فلسفیانہ نظامہائے فکر میں سے صرف ارسطو ہی کے فلسفہ کو تنقید و تردید کا موضوع بنایا، "تہافت الفلاسفہ" میں لکھتے ہیں:-

"جاننا چاہیے کہ فلاسفہ (یونان) کے اختلافات میں غور و خوض تطویل لاطائل ہے، کیونکہ ان کا تخبط طویل ہے، ان کی نزاعیں کثیر ہیں، ان کے آراء و مذاہب میں پراگندگی ہے، اور ان کے مناہج بحث ایک دوسرے سے الگ ہیں، لہذا ہم صرف ان کے پیشوا کی رایوں میں جو تناقض ہے، اسی کے اظہار پر اکتفا کریں گے، یہ پیشوا ارسطو ہے جو فلسفی علی الاطلاق اور معلم اول ہے، اسی نے ان کے علوم کو ترتیب دیا اور ان کے گمان میں انھیں منقح کیا تھا، اور حشو و زوائد کو حذف کرکے ان کے اصولی زعومات (ظنون) کو منتخب کیا تھا"۔

اور ارسطو کی تعلیمات کی اس کے جانشینوں نے جو مختلف توضیحیں کی ہیں، ان میں سے انھوں نے صرف ابو نصر فارابی اور بو علی سینا ہی کی توضیحات کو منتخب کیا، چنانچہ اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"پھر جن لوگوں نے ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ کیا ہے، ان کا کلام بھی تحریف و تبدیل سے خالی نہیں ہے، اور اسی لیے تفسیر و تاویل کا محتاج رہا ہے، اسی اختلاف تفسیر کی وجہ سے ارسطو کی مراد متعین کرنے کے بارے میں اس کے متبعین کے درمیان بڑی نزاعیں پائی جاتی ہیں، فلاسفۂ اسلام میں اقوال ارسطو کے نقل اور تحقیق میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ابو نصر فارابی اور ابن سینا کی تصانیف ہیں، اس لیے مجوزہ ابطال و تردید کی کوشش میں ہم اسی چیز (کے رد) پر اقتصار کریں گے جسے اپنے گمراہ رؤساء مذہب کے اقوال میں سے ان دونوں نے پسند کیا ہے اور صحیح سمجھا ہے، کیونکہ جس چیز کو ان دونوں نے چھوڑ دیا اور جس کی پیروی سے بے اعتنائی برتی ہے، اس کے مختل و مشکوک ہونے میں کوئی شک نہیں اور نہ اس کے ابطال کے لیے کسی غور و فکر کی ضرورت ہے، پس جاننا چاہیے کہ مذاہب فلاسفہ کے رد کے بارے میں ہم انھیں دونوں شخصوں کی نقل پر اقتصار کریں گے"۔

یہی حال ان کے دوسرے علوم کا ہے، چنانچہ ان کے ریاضی و ہندسہ کی بنیاد بھی یونانی ریاضی و ہندسہ ہی پر رکھی گئی، اس لیے اصولی طور پر اقلیدسی ہندسہ میں اقلیدس کی "کتاب الاصول" کو مخروطات میں ابلونیوس کی "کتاب المخروطات" کو، ہندسۂ کرویہ میں متوسطات کے متعلقہ متون کو اور نظریۂ اعداد میں نیقوماخس الجراسینی اور دیوفنطس کی "کتاب الحساب" کو انھوں نے اپنی علمی کاوشوں کی بنیاد بنایا، ہیئت میں بھی بطلیموس کی "کتاب المجسطی" ان کی فلکیاتی سرگرمیوں کا سنگ بنیاد رہی، اگرچہ انھوں نے ہند اور ایرانی علم ہیئت سے بھی استفادہ کرنے میں دریغ نہیں کیا، اور تینوں کی مدد سے ایک مستقل ہیئتی نظام فکر کی تشکیل کی، تاہم اصول نظریاتی طور پر وہ منصور عباسی کے زمانہ سے لیکر رصدگاہ محمد شاہی کے قیام تک ارسطو اور بطلیموس

کے "ارض مرکزی" نظریہ ہی کے قائل رہے، اگرچہ وہ اپنے یونانی پیشروؤں کے ورثہ پر نہ صرف بیش قیمت اضافے، بلکہ ان کی اصلاح بھی کرتے رہے،

طب میں اصولی طور پر وہ بقراط و جالینوس کے "نظریۂ اخلاط" کو اپنی طبی تفکیر کا سنگ بنیاد بنائے رہے بلکہ عرصہ تک تو جالینوس کے طبی رسائل ہی ان کے مدارس طبیہ میں داخل درس رہے، بعد میں ان کے مواد کو جدید طور سے مرتب کر کے اساطین اطبائے اسلام نے نئی تصانیف کیں،

غرض نام نہاد "اسلامی فلسفہ و حکمت کی اساس یونانی فلسفہ و حکمت پر رکھی گئی، اس لیے اسے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے یونانی علم و حکمت" کے آغاز و ارتقاء کا اجمالی تذکرہ ناگزیر ہے۔

یونانی علم و حکمت | یونان میں علم و حکمت کی ابتدا تالیس الملطی (۶۲۴ ۔ ۵۴۶ ق م) سے بتائی جاتی ہے اور اس کی انتہاء ایتھنز کے مدرسۂ فلسفہ کی قفل بندی (۵۲۹ء) پر ہوتی ہے، اس ہزار سالہ مدت میں یونانی عبقریت نے متعدد حکماء و فلاسفہ پیدا کیے جنھوں نے منطق و فلسفہ، ریاضی و ہیئت اور سائنس و طب کے علوم کو سائنٹفک بنیادوں پر مدون کیا،

یونانیوں کا علم و حکمت محض ان کے ابتکار فکر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ انھوں نے فلسفہ مشرق سے، ہندسہ و ہیئت مصر و بابل سے اور حساب فنیقیا سے لیا تھا، ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے امم قدیمہ کے اس ثقافتی ورثہ کو سائنٹفک انداز پر منظم کیا۔

یونانیوں کی ان علمی مساعی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:۔

(۱) **قبل سقراطی عہد**۔ اس زمانہ میں یونانی فکر کائنات کے مبداء اولین کی تلاش و تجسس میں مصروف رہی، اس دور کا مشہور حکیم تالیس ہے، جو فلسفہ کے علاوہ یونانی ہندسہ و ہیئت کا بھی بانی ہے، اس دور کا دوسرا مشہور فلسفی فیثاغورث تھا، جو ہندسہ و ہیئت میں ممتاز مقام رکھتا ہے، "اصول ہندسہ" (اقلیدس) کا بڑا حصہ اس کی اور اس کے متبعین کی کاوشوں پر مشتمل ہے، وہ عرصہ تک علم الہیئت میں

اس فلکیاتی نظام کا بانی سمجھا جاتا رہا، جو زمین کے بجائے آفتاب کو مرکز کائنات قرار دیتا ہے،

اس عہد کے دو اور فلسفی مسلمانوں میں مشہور تھے: ایک انبذقلیس (Empedocles) جو "نظریۂ عناصر اربعہ" کا بانی ہے اور دوسرا دیمقراطیس (Democritus) جس نے "سالمات (Atoms) یا اجزاء لایتجزی کے نظریہ کی بنیاد ڈالی اور جس کے محور کے گرد بعد میں حکماء و متکلمین کی ایک اہم نزاع عرصہ تک گردش کرتی رہی،

(۲) **یونانی فلسفہ کا عہد زریں**۔ یہ عہد سقراط، افلاطون اور ارسطو کے علمی کارناموں پر مشتمل ہے، قبل سقراطی عہد نے ذہن انسانی کی اس صلاحیت ہی کو مشکوک الافادیت بنا دیا تھا جو علمی اکتشافات کی اصل ہے، اس لیے معمائے کائنات کے سلجھانے کے سلسلہ میں انکی کاوشوں کا انجام فرقہ سوفسطائیہ کے سفسطہ اور ارتیابیت کی شکل میں نمودار ہوا جس کا ماحصل صرف اتنا تھا کہ

کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اس انداز فکر میں تبدیلی ضرور تھی، اور اس کا افتتاح سقراط نے کیا، اس نے کائنات کے بجائے نفس انسانی کو فلسفیانہ تحقیق کا موضوع بنایا، اس کا کہنا تھا کہ نیکی ہی علم ہے،

سقراط کا شاگرد افلاطون تھا، جو استاد کی وفات پر سسلی چلا گیا تھا، وہاں وہ فیثاغورث کے تلامذہ سے متاثر ہوا، فلسفہ کے علاوہ اس نے ریاضی و ہیئت کی ترقی میں بھی حصہ لیا، چنانچہ اکادیمیائے افلاطون کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ریاضی نہ جانتا ہو وہ ہماری درسگاہ میں نہ آئے، اسی طرح علم الہیئت میں وہ اس فلکیاتی نظام کا بانی ہے جو اجرام سماوی کی گردش کا حساب متوازی اور ہم مرکز کرات کی مجموعی گردش سے مستخرج کرنے کی کوشش کرتا ہے،

سقراط اپنے پیشروؤں کے برخلاف مابعد الطبیعی قیاس آرائیوں سے بیزار تھا، شروع میں افلاطون کو بھی ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر جب وہ پیروان فیثاغورث کے حلقۂ اثر میں پہنچا تو

اس نے بھی یہ قیاس آرائی شروع کردی، فیثا غورث کائنات کی اصل "اعداد" کو قرار دیتا تھا، افلاطون نے "تصورات" (Ideas = Logos) کو قرار دیا جنھیں بعد میں اسلامی فلسفہ کے اندر "اعیان مجردہ" اور "امثال افلاطونی" کا نام دیا گیا، اسلامی فکر میں افلاطون کو "اشراقی فلسفہ" کا امام بھی سمجھا جاتا رہا ہے، یہ اشراقی فلسفہ چھٹی صدی ہجری [شہاب الدین سہروردی مقتول اور بالخصوص اس کی "حکمۃ الاشراق" کے بعد سے مشائی (ارسطا طالیسی) فلسفہ کا حریف بتایا جاتا] رہا ہے،

افلاطون کا شاگرد ارسطو تھا، جو یونانی علم وحکمت کا مثل اعظم ہے، مسلمانوں میں "یونانی حکمت" اور ارسطو مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:-

"اور ارسطو پر یونانیوں کا فلسفہ ختم ہوگیا، وہ ان کے حکما کا خاتم اور ان کے علما کا سردار ہے۔"

ارسطو نے منطق کو سب سے پہلے مدون کیا اور اس لیے وہ مسلمانوں میں "صاحب المنطق" اور "معلم اول" کہلاتا ہے، بعد میں اس کی منطقی نگارشات آٹھ کتابوں میں مدون کی گئیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) قاطیغوریاس یا کتاب المقولات (۲) باری ارمینیاس یا کتاب العبارۃ (۳) انالوطیقا یا کتاب القیاس (۴) ابو دیقطیقا یا کتاب البرہان (۵) طوبیقا یا کتاب الجدل (۶) سوفسطیقا یا کتاب الحکمۃ المموہۃ (۷) ریطوریقا یا کتاب الخطابۃ (۸) ابوطیقا یا کتاب الشعر

افلاطون کی طرح ارسطو نے بھی ما بعد الطبیعی قیاس آرائیوں کو جاری رکھا، مگر استاد کے "امثال" کو رد کرکے "مادہ اور صورت" پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی اور اس نظام فکر کی ابتدا کی جو نام نہاد اسلامی فلسفہ کی اصل ہے۔ اس کی طبیعیاتی نگارشات بھی مسلمانوں میں آٹھ کتابوں کے اندر منتقل ہوئیں،

(۱) کتاب السماع الطبیعی (۲) کتاب السماء والعالم (۳) کتاب الکون والفساد۔ (۴) کتاب الآثار العلویہ (۵) کتاب الحیوان (۶) کتاب النباتات (۷) کتاب الحس والمحسوس (۸) کتاب النفس

الٰہیات میں اس کی کتاب "ما بعد الطبیعہ" اور "کتاب الحروف" کے نام سے مشہور تھی، بعد میں ارسطو کا

حلقۂ فکر "مشائیت" کے نام سے موسوم ہوا،

ارسطو نے ریاضی بالخصوص ہیئت کو بھی سائنٹفک بنیادوں پر قائم کیا، افلاطون اور افلاطون کی پیروی میں ایوڈوکس نے اجرام سماوی کی گردش کی توجیہ کے لیے ہم مرکز متشابہ الحرکۃ کرات کے نظریہ کو پیش کیا تھا، ارسطو بھی اسی نظریہ کا قائل تھا، مگر اس کے یہاں "افلاک جزئیہ" کی تعداد بڑھ کر چھپن (۵۶) کے قریب پہنچ گئی تھی،

ان کے علاوہ عملی فلسفہ میں اس کی "کتاب الاخلاق" فلاسفہ اسلام میں بہت زیادہ مقبول ہوئی، لیکن اس کی کتاب السیاستہ کو وہ قبول عام نصیب نہ ہوسکا جو افلاطون کی "کتاب السیاستہ" (Republic) کو حاصل ہوا،

ان اصلی کتابوں کے علاوہ کچھ جعلی کتابیں بھی اس کی طرف منسوب تھیں، ان میں سب سے اہم "اثولوجیا" ہے جو تصنیف تو کسی متاخر نو افلاطونی (Neo-Platonist) کی ہے، مگر بڑے بڑے اساطین حکمائے اسلام بھی اسے ارسطو ہی کی تصنیف سمجھتے تھے،

(۳) بعد ارسطا طالیسی عہد:- اس زمانہ میں فلسفہ میں افلاطون وارسطو کے مدارس کے علاوہ تین تحریکیں اور چل رہی تھیں:

پہلی تحریک "ارتیابیت" (Scepticism) کی تھی جو ارسطا طالیسی "اذعائیت" کا رد عمل تھی، اس کا بانی پرہو تھا، یہ اتنی مقبول ہوئی کہ خود اقادیمیائے افلاطون کے متاخر جانشینوں میں یہ ذہنی وبا سرایت کرگئی تھی، ان میں کارنیاڈیز خاص طور سے مشہور ہے، بعد کے مشککین میں انیسیڈیموس اور اگرپا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

مسلمان فلاسفہ ومفکرین ان لوگوں کی شخصیت سے تو آشنا نہ تھے، لیکن یقینی علم کے حصول کے خلاف انھوں نے جو دلائل دیے تھے ان سے بخوبی واقف تھے۔

دوسری تحریک "ابیقوریت" کی تھی، اس کا بانی ابیقورس (Epicurus) تھا،

یہ تحریک علمیات میں "حواس پرستی" (Empiricism) کی، طبیعیات میں "ذرویت" (Atomism) کی اور اخلاقیات میں "لذت پرستی" (Hedonism) کی قائل تھی۔

تیسری تحریک "رواقیت" (Stoicism) کہلاتی تھی، جو اخلاقی ترقی پر بہت زیادہ زور دیتی تھی، مسلمانوں میں اس کے پیرو "اصحاب المظال" کہلاتے تھے۔

ارسطو اور سکندر نے سال بھر کے فرق سے وفات پائی، موخر الذکر کی وفات پر اس کی عظیم الشان سلطنت اس کے جرنیلوں میں بٹ گئی، مصر بطلیموسی خاندان کے حصہ میں آیا جو اپنے ساتھ یونان سے علمی سرپرستی کی روایات بھی لیتا گیا، اس طرح کچھ ہی دن میں اسکندریہ علم و حکمت کا مرکز بن گیا، دوسرے بطلیموسی تاجدار بطلیموس منطقی نے اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کو قائم کیا جس میں حسب تصریح ابوالفرج ابن العبری ایک لاکھ چودہ ہزار کتابیں تھیں۔

ارسطو کے شاگردوں کی ایک جماعت بھی اسکندریہ پہنچی، جہاں انھوں نے "معلم اول" (ارسطو) کی تعلیمات کو کم و بیش ایک ہزار سال تک جاری رکھا، سنہ مسیحی کے آغاز کے قریب (۳۰ ق م میں) رومیوں نے مصر کو فتح کرکے رومن سلطنت میں شامل کر لیا، اس وقت اسکندریہ کے مدرسہ فلسفہ کا صدر اندرونیقوس تھا، جس نے رومی فاتح قیصر آگسٹس کے حکم سے ارسطو کی تصانیف کا مستند ایڈیشن تیار کیا، بعد کے مشائی معلمین میں سے اسکندر افرودیسی اور تامسطیوس کے ناموں اور ان کی شروح سے مسلمان فلاسفہ بخوبی واقف تھے۔

بطالمہ ہی کے عہد میں ریاضی و ہیئت کے بڑے بڑے عبقری پیدا ہوئے، جیسے اقلیدس، اپلونیوس، ارشمیدس، ایرن وغیرہ۔

اقلیدس نے علم ہندسہ کی مشہور کتاب "اصول ہندسہ" کو تیرہ مقالوں میں مرتب کیا، جو نہ صرف یونان کی ہندسی ذہانت کا شاہکار ہے بلکہ جسے علم الہندسہ کی "کتاب مقدس" سمجھنا چاہیے، بعد میں حکیم البستلادس (Hypsicles) نے دو اور مقالے بڑھائے۔

اپلونیوس نے "کتاب المخروطات" (Conics) کو آٹھ مقالوں میں مدون کیا تھا، مگر بعد میں کچھ تو عام علمی جمود کی وجہ سے اور کچھ اپنے عسیر الفہم ہونے کی بنا پر یہ کتاب مٹ گئی، چنانچہ آج اس کے نصف آخر کا یونانی زبان میں بھی پتہ نہیں ہے، مگر دنیائے علم و حکمت پر مسلمانوں کا بڑا احسان ہے کہ تیسری صدی ہجری (نویں صدی مسیحی) میں انھوں نے اسے کسی نہ کسی طرح تلاش کرکے عربی میں ترجمہ کر لیا تھا، اسی عربی ترجمہ کی مدد سے سترہویں صدی مسیحی میں پروفیسر ہیلے نے اس کا معیاری ایڈیشن شائع کیا۔

ارشمیدس (Archemedes) کا نام قانون ثقل اضافی کی دریافت کے لیے مشہور ہے، اس کے علاوہ وہ ریاضیات کی مختلف شاخوں میں بھی کمال رکھتا تھا، اس سلسلے میں اس کی کتاب "کتاب الکرہ والاسطوانہ" خاص طور سے مشہور تھی، اور اس کے ساتھ مسلمان ہندسہ دانوں نے خصوصی اعتناء کیا، اسی کتاب کے ایک مسئلہ کے حل کے سلسلے میں مسلمان فضلاء نے درجہ سوم کی مساوات کے حل پر توجہ دی اور آخر کار عمر خیام نے ان مساواتوں کو منظم طور پر حل کیا۔

ایرن، میکانکس (Mechanics) میں ید طولیٰ رکھتا تھا، اور اپنی اسی مہارت کی بنا پر مسلمانوں میں "ایرن المجانیقی" کے نام سے مشہور ہوا، اس نے اس فن پر "کتاب الحیل" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جو عرصہ تک اس فن کی معتمد علیہ سمجھی جاتی رہی، "کتاب الحیل" کے علاوہ اس نے "اصول اقلیدس" کے مشکل مقامات کی شرح بھی لکھی تھی جس کا مسلمان فضلاء نے "حل شکوک اقلیدس" کے نام سے ترجمہ کیا تھا، مگر آج یہ کتاب ناپید ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی مشاہیر مہندسین و ماہرین ریاضیات اس زمانہ میں پیدا ہوئے، جنھوں نے یونان کے ہندسی ادب بالخصوص "کروی ہندسہ" کی ثروت میں بیش بہا اضافے کیے، ان کے علمی مساعی

سے ہندسی ادب کے وہ شاہکار ظہور میں آئے جو مسلمانوں میں "متوسطات" کے نام سے مشہور تھے یعنی وہ
رسائل جو "اصول اقلیدس" اور "المجسطی" کے درمیان پڑھائے جاتے ہیں، ان میں سے مشہور مصنفین اور انکی
تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

اقلیدس : کتاب المعطیات، کتاب ظاہریات الفلک، کتاب المناظر [اصول اقلیدس کے
علاوہ جو اس کا شاہکار ہے]

اوطولوقیوس : کتاب الکرۃ المتحرکہ، کتاب الطلوع والغروب،

ارشمیدس : کتاب المأخوذات، کتاب الکرۃ والاسطوانہ،

مانالاؤس : کتاب الاکر،

ارسطرخس : کتاب جرمی النیرین،

ثاؤذوسیوس : کتاب الاکر، کتاب الایام واللیالی، کتاب المساکن،

البسقلاؤس : کتاب المطالع [اصول اقلیدس کے ضمیمہ یعنی چودھویں اور پندرھویں مقالے کے علاوہ]

ریاضی وہندسہ کے ساتھ ہیئت میں بھی بڑی ترقی ہوئی، افلاطون نے اجرام سماوی کی گردش
کو ہم مرکز کرات کی حرکات متشابہہ کے ذریعے منضبط کرنے کا اصول پیش کیا تھا، عرصہ تک یونانی ہیئت دانوں
کا اسی اصول پر عمل رہا، ان میں ایوذوکس، کالپس اور ارسطو پیش پیش تھے، لیکن تیسری صدی قبل
مسیح کے نصف آخر میں اپلونیوس نے ہم مرکز کروں کے نظریہ کو مسترد کر کے "خوارج" (Eccentric)
اور "تداویر" (Epicycles) کے نظریہ کے ذریعہ سیاروں کی حرکات منضبط کرنے کی کوشش کی،
سب سے پہلے ابرخس (Hipparchus) نے اس نظریہ کو آفتاب و ماہتاب کی حرکت کے ضبط
کرنے میں استعمال کیا، بعد میں بطلیموس نے باقی سیارات کے بارے میں اس سے کام لیا،
اسی زمانہ میں مشہور یونانی جغرافیہ داں ایراتوستھنیس نے اسکندریہ اور اسوان کے درمیان

دائرہ نصف النہار ارضی کے ایک درجہ کی لمبائی ناپنے کا تجربہ کیا اور اس طرح محیط ارضی کی پہلی مرتبہ
پیمائش کی گئی،

ریاضی وہیئت کے علاوہ طب کو بھی غیر معمولی ترقی ہوئی، فن طب کا افسانوی بانی اسقلیبیوس
کو سمجھا جاتا تھا لیکن قدیم زمانہ میں اس فن کا سب سے بڑا نمائندہ بقراط تھا، سنہ مسیحی کی ابتدا کے قریب
اسکندریہ میں جالینوس نے فن طب کو خاص طور سے ترقی دی، بقراط اور جالینوس کی طبی تصانیف
کے ساتھ مسلمان اطبا نے خصوصی اعتنا کیا،

(۴) یونانی فلسفہ کا آخری عہد : یہ عہد گذشتہ چھ سو سال کی عقلیت مفرطہ کا ردعمل تھا،
فلسفہ اب مسلسل ذہنی کاوش سے تھک چکا تھا، اور سکون قلبی کے لیے مذہب کے دامن میں پناہ ڈھونڈنا
چاہتا تھا، اس جذبے نے تین شکلیں اختیار کیں،

یونانی یہودی فلسفہ : کچھ لوگوں نے قلبی تسکین کو مشرقی مذاہب بالخصوص یہودیت میں تلاش کرنا
چاہا، خود یہودی بھی اپنی مذہبی تعلیمات کو منطقی بنیادوں پر مستحکم کرنا چاہتے تھے، اس کوشش کا نتیجہ "یونانی
یہودی فلسفہ" کی شکل میں برآمد ہوا، اس تحریک کا علمبردار خصوصی فائلو اسکندروی تھا، وہ ذات باری تعالیٰ
کی "تنزیہہ" پر ضرورت سے زیادہ زور دیتا تھا، اس غلو نے "تعطیل" کی شکل اختیار کی، یہی "تنزیہہ نما
تعطیل" مدینہ منورہ کے یہودیوں میں پہنچی، جن سے مسلمان متکلمین نے اخذ کیا، اسی کا شاخسانہ مامون الرشید
کے زمانہ میں "خلق قرآن" کے مسئلہ کی شکل میں ظاہر ہوا جس سے انکار کی بنا پر بڑے بڑے علمائے کرام
کو قید وبند کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں،

نوفیثاغورثیت : لیکن متعصب یونانی مفکرین دوسروں (یہود) کے مذہب سے تسکین حاصل
کرنے کے بجائے اپنے قومی مذہب ہی میں سکون تلاش کرنے پر مصر تھے، اس لیے انھوں نے فیثاغورث
کی سری تعلیمات کو "نوفیثاغورثیت" کے نام سے زندہ کیا،

عہد اسلام میں رسائل اخوان الصفا کے مصنفین اسی "نوفیثا غورثیت" سے زیادہ متاثر تھے۔

نوفلاطونیت: لیکن تفلسف پسند طبائع اس احیائی تحریک کو قبول نہ کرسکیں، انھوں نے افلاطون کی تعلیمات کی بنیاد پر ایک عالمگیر مذہب کی بناڈالنے کا تہیہ کیا، یہ "نوافلاطونیت" تھی، جس کے اساطین ثلثہ فلاطینوس، فرفوریوس اور ایاملیخس تھے، ان لوگوں نے ایک جانب افلاطون و ارسطو کی تعلیمات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی، اور دوسری جانب قومی مذہب کی تائید میں سرگرمی دکھائی،

افلاطون و ارسطو کی تعلیمات میں مطابقت کی کوشش ان نوفلاطونی فلاسفہ کا خاص کارنامہ تھا، بعد میں سریانی حکماء نے بھی ان کی اس کوشش کو جاری رکھا، مسلمان فلاسفہ میں فارابی اس تحریک تطبیق کا بڑا سرگرم نمایندہ تھا، چنانچہ اس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بعنوان "الجمع بین رائے الحکیمین" لکھی جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ افلاطون و ارسطو کی تعلیمات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قومی مذہب کی تائید نے دو شکلیں اختیار کیں: مسیحیت آزاری اور توہم پرستی،

مسیحیت "بادشاہ پرستی" سے انکار کی وجہ سے عرصہ سے رومن حکام کی نظروں میں مشتبہ تھی، چنانچہ مسیحیت کی پیدایش کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اس کے متبعین پر ظلم وستم شروع ہوگیا، بعد میں اس "مسیحیت آزاری" میں رومن حکام کے ساتھ یونانی فلاسفہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا: پہلے رواقیوں نے اور پھر نوفلاطونی فلاسفہ نے، حتی کہ فرفوریوس جیسے سنجیدہ مفکرین نے بھی اپنی تفکیری صلاحیتوں کو مسیحیت کی تردید میں ضائع کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

اس کے ساتھ فلاطینوس اور اس کے متبعین نے قومی مذہب کی حمایت میں اس درجہ مبالغہ کیا کہ توہم پرستی کی آخری حد تک پہنچ گئے، پروفیسر تھلی لکھتا ہے:

"فلاطینوس شرک و تکثیر سے بیزار نہیں ہے ...... وہ اچھی اور بری ارواح جنات اور بھوت پریت

پر بھی اعتقاد رکھتا ہے، جو اس کے خیال میں عالم تحت القمر کے اندر آباد ہیں، اس کے ساتھ وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ خیالات کی مدد سے دور دراز کے فاصلوں پر اثرات ڈال سکتے ہیں ......

اس کے بعد کے جانشینوں نے ان توہمات میں اور بھی مبالغہ کیا: انھوں نے عوامی شرک و تکثیر کی حمایت کی، مسیحی مذہب پر حملے کیے اور جادو ٹونوں اور خرافات میں انہماک اختیار کیا"۔

ظاہر ہے کوئی تہذیب توہم پرستی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی، یوں بھی یونانی عبقریت بوڑھی ہوچکی تھی، اس کی افادیت کے دن پورے ہوچکے تھے، چنانچہ پروفیسر تھلی یونانی فلسفہ کے آخری عہد کے بارے میں لکھتا ہے:-

"اب اس فلسفہ میں کوئی جان نہیں رہ گئی تھی، قدیم شرک و تکثیر میں جان ڈالنے اور پرانی تہذیب کو بچانے کے سلسلے میں اس کی تمام کوششیں بے سود تھیں، یہ فلسفہ اپنی افادیت کے دن پورے کرچکا تھا"۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۵۲۹ء میں قیصر جسٹینیان نے یونانی فلسفہ و ثقافت کی اس بوسیدہ لاش کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی، جیسا کہ ویبر لکھتا ہے:

"۵۲۹ء میں شرک پسند نوفلاطونیت کی آخری جائے پناہ یعنی ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ جہاں برقلس نے تعلیم دی تھی، شاہنشاہ جسٹینیان کے حکم سے بند کر دیا گیا، عہد ماضی کے اس منہدم آثار سے عوام اس درجہ بے پروا تھے کہ شاید ہی کسی نے اس شاہی اعلان کا نوٹس لیا ہو"۔

نوفلاطونی فلاسفہ کے درمیان مسلمان حکماء، و مورخین حکمت دو فلسفیوں برقلس اور سنبلیقیوس سے واقف تھے، وہ ایک تفلسف پسند عیسائی سے بھی اچھی طرح واقف تھے، یہ یحیی النحوی تھا، یحیی النحوی فلسفہ کا بھی مبصر نقاد تھا، اور بعد کے مسلمان مفکرین (بالخصوص متکلمین جیسے امام غزالی) نے یونانی فلسفہ کی تردید میں اس کی تصانیف سے استفادہ کیا تھا، مگر متاخر مسلمان مورخین میں اس کی (یحیی النحوی کی) شخصیت کے متعلق بڑی غلط فہمیاں تھیں، ان کا خیال تھا کہ وہ عربوں کی فتح مصر کے وقت تک

زندہ تھا، اور جب اس نے فاتح مصر عمرو بن عاص سے اسکندریہ کی لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت چاہی تو انھوں نے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس لائبریری کو جلادیا، اس غلط فہمی کی وجہ سے یورپین معاندین اسلام کو مسلمانوں پر کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام لگانے میں بڑی آسانی ہوئی، حالانکہ یہ لائبریری عرصہ ہوا جل کر خود عیسائی متعصبوں کے ہاتھوں خاک سیاہ ہو چکی تھی،

عرفانی فلسفہ کے سلسلے میں اس آخری دور میں ایک کتاب "اثولوجیا" لکھی گئی جسے عرصہ تک مسلمان مفکرین حتی کہ فارابی بھی ارسطو کی تصنیف سمجھتے رہے، ابن الندیم اسے "اثولوجیا" کے عنوان سے برقلس افلاطونی (نو افلاطونی) کی تصنیف بتاتا ہے، لیکن جدید تحقیقات کہتی ہیں کہ یہ کسی تفلسف پسند سریانی کی تصنیف تھی،

اس عرفانی فلسفہ کے علاوہ اس دور میں خالص علمی اور سائنسی کام بہت کم ہوا،

دوسری صدی مسیحی میں بطلیموس نے "المجسطی" تصنیف کی جو نہ صرف یونانی علم الہیئت کی معراج کمال ہے، بلکہ دنیا کے ہیئتی ادبیات عالیہ میں نمایاں مقام رکھتی ہے، آخری عہد میں تاؤن (Theon) نے اقلیدس کی "اصول ہندسہ" اور بطلیموس کی "المجسطی" کو از سر نو مرتب کیا، اس نے کچھ فلکیاتی مشاہدات بھی کیے،

علم الحساب میں دو شخصوں کا نام قابل ذکر ہے: ذیوفنطس کا جس نے علم الجبر و المقابلہ کے لیے راستہ ہموار کیا (کیونکہ اس نے ابتدائی درجے کی مساواتوں کے حل پر بحث کی تھی) دوسرا نام نیقوماخس جہراسنی کا ہے، جس کی "ارثماطیقی" بعد کے حساب دانوں کا معمول بہ رہی،

ہندسہ کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ فرفوریوس نے "اصول اقلیدس" کی شرح لکھی تھی لیکن یہ قول محتاج تحقیق ہے، برقلس نے پہلے مقالہ کی شرح لکھی تھی، مگر غالباً مسلمان فضلا اس سے واقف نہ تھے، البتہ سنبلیقیوس کی شرح مصادرات اقلیدس عربی میں ترجمہ ہوئی تھی، اور مسلمان مہندسین نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا تھا، اوطوقیوس نے "مخروطات ابلونیوس" کے پہلے مقالہ کی شرح لکھی تھی، یہ بھی عربی میں ترجمہ ہو گئی،

لیکن طب کے سلسلے میں اسکندریہ کے حکما نے شائستہ خدمات انجام دیں اور ساتویں صدی مسیحی (بعثت اسلام کے زمانہ) تک یہ مدرسہ طبی خدمات کے لیے مشہور رہا، آخر زمانہ میں یہاں کے سات طبیب اس لیے مشہور ہوئے کہ انھوں نے جالینوس کی طبی تالیفات میں سے سولہ کتابیں منتخب کرکے داخل درس کیں، ان میں سب سے مقدم انقیلاوس تھا، دوسرے اطبا اصطفن، جاسیوس، انادوسیوس، اکیلاوس، فلاذیوس اور یحیی النحوی تھے،

ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی کا ذکر کرنے کے بعد پروفیسر ہٹی لکھتا ہے:

"اب مستقبل اس نئے مذہب کا منتظر تھا جس کے خلاف اس فلسفہ نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا"

مگر فاضل پروفیسر خوش فہمی کی بنا پر اس "نئے مذہب" کو عیسائی مذہب سمجھتا ہے، حالانکہ یہ مزعومہ "نیا مذہب" (مسیحیت) عہد نو افلاطونی کی مٹتی ہوئی یونانی ثقافت سے کہیں زیادہ "توہم پرستی" اور "عقلیت بیزاری" کا گہوارہ تھا، چنانچہ قرون وسطی کے یورپ کی (جو اس نئے مذہب کی سرگرمیوں کا نقطۂ عروج ہے) علمی و ثقافتی خدمات کے بارہ میں ایک فرانسیسی مورخ رقمطراز ہے:

"۵۲۹ء سے لیکر جب کہ قیصر جسٹینیان نے یونانی مدارس کو بند کر دیا تھا، ۱۶۳۷ء تک جبکہ ڈیکارٹ کی مقالات بر مناہج شائع ہوئی، یورپ کی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا یا یوں کہیے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو تفکر و رویت کے حضور میں لانا ہی بند کر دیا تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ "نیا مذہب" مسیحیت نہیں تھا، بلکہ اسلام تھا جس نے کچھ ہی عرصہ میں معمورۂ عالم کے ایک بڑے حصہ کو اپنی چمک سے بقعۂ نور بنا دیا تھا،

مگر یہ مستقل بحث ہے اور اسی توضیح کے لیے ایک مستقل بسط کی مقتضی ہے۔

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

الہ آباد (۴)

از

جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری لکھنؤ یونیورسٹی

(۴)

الہ آباد میں اردو شاعری کا چوتھا دور یعنی انیسویں صدی کا نصف آخر (۱۸۵۰ء سے ۱۹۰۰ء تک) اردو شاعری کے عروج کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں منشی محمد اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی الہ آباد آئے، ان کی آمد سے یہاں ناسخ کے آنے کا منظر ایک مرتبہ پھر تازہ ہوگیا، ہر طرف شعر و سخن کی محفلیں جمنے لگیں، لکھنوی رنگ جو ناسخ کے اثر سے یہاں رائج ہوچکا تھا، ان کے شاگرد منیر کی آمد کے بعد مقبولیت کی انتہا کو پہنچ گیا، زبان کی صفائی اور بندش پر زیادہ توجہ دیجانے لگی، مشاعروں میں دوغزلے سہ غزلے پڑھے جانے لگے، شاعروں کی تعداد بہت بڑھ گئی، اور یہاں ایک ایسا شاعرانہ ماحول پیدا ہوگیا جس میں چند ایسے شعراء پیدا ہوئے جنھوں نے اردو کے عظیم ترین شعراء میں اپنی جگہ بنالی، مثلاً محمد جان خاں جرأت (متوفی ۱۸۶۵ء) آتش لکھنوی کے مشہور شاگرد اعظم علی اعظم کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے، نمونۂ کلام[1] یہ ہے:

اس جگہ دل کو لیگئی تقدیر — کہ تصور جہاں گزر نہ کرے

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں — سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

[1] بزم خیال ص ۱۳۳، خمخانۂ جاوید، ج سوم ص ۴۴۵

دکھلائے خدا اس بتِ گلفام کی صورت — دنیا میں یہی ہے مرے آرام کی صورت

مجال کیا جو کریں عذر حکم یار میں ہم — دل اس کی قید میں ہے دل کے اختیار میں ہم

بلا کی حسن میں آرائش و ایجاد کرتے ہیں — پریزادوں کو دیوانہ یہ آدم زاد کرتے ہیں

دیدۂ بیدار جو کچھ دیکھنا ہے دیکھ لے — حشر تک جس سے نہ چونکے گا وہ خواب آنے کو ہے

فیاض علی خاں فیاض دریا گنج کے رئیس اور اشرف علی خاں اشرف کے بیٹے تھے، اردو و فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، ۱۸۸۳ء میں انتقال ہوا، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

نزع میں عدو کے میری جان رہتی ہے — لیکن مدد شاہ زمان رہتی ہے

رہتا ہوں دل آزاروں میں لیکن بچ کے — جس طرح سے دانتوں میں زبان رہتی ہے

کر رہا ہے عدم شاید — یا میں ہی دیکھتا ہوں کم شاید

پھر بتوں کی طرف چلا فیاض — ہاتھ کچھ آگئی رقم شاید

شاہ امین الدین قیصر (پیدائش ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء وفات ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء) الہ آباد کے ایک معزز صوفی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، عربی و فارسی تعلیم آگرہ میں حاصل کی اور وہیں اعظم علی اعظم کے شاگرد ہوگئے، اپنے والد کے انتقال کے بعد الہ آباد کی دیوانی میں مختلف عہدوں پر رہ کر پنشن پائی اور خانہ نشین ہوگئے، غزل کے علاوہ مرثیہ، سلام، نعت اور منقبت وغیرہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے، اور الہ آباد کے سربرآوردہ شعراء میں شمار ہوتے تھے[1]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

گریباں گیر ہوتا کیوں لہو پھر میری گردن کا — کفن ملتا اگر بعد فنا قاتل کے دامن کا

کیا ہے پرزے پرزے تو نے اے دستِ جنوں ایسا — رفو ہونا نہیں ممکن ہمارے جامۂ تن کا

خیال دل میں جو آیا سیاہ کاری کا — سفید ہوگئے مثل کفن مزار میں ہم

[1] چراغ محفل فصاحت ص ۴۴

میر سجاد علی سجادؔ میر حیدر علی کے لڑکے اور موضع کھرا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے، علی اوسط رشکؔ کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے[1]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے،

صدقہ تیرے قد پہ لاکھوں خوش قد
آنکھوں پہ فدا ہزار آنکھیں

گلرنگ ہیں آستین و دامن
دکھلاتی ہیں کیا بہار آنکھیں

دو دن میں گھٹ گئی محبت
کرتے نہیں مجھ سے چار آنکھیں

منشی عبد الکریم ثمرؔ بھول پور ضلع الہ آباد کے باشندے تھے، اور امیر مینائی سے مشورۂ سخن کرتے تھے، کلام میں صفائی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے[2]، نمونہ کلام درج ذیل ہے:۔

تو حسن میں خوبی میں کہیں اس سے سوا ہو
دیکھا ہے تجھے حضرت یوسف کو سنا ہو

اس ابر میں پرہیز تجھے مے سے ہو زاہد
پی لے ارے کمبخت کہ ایسے میں روا ہو

کچھ دوست سے امید نہ اندیشۂ دشمن
ہوگا وہی جو کچھ مری قسمت میں لکھا ہو

خان بہادر میر علی عباد ضیاںؔ موضع کھرا ضلع الہ آباد کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم ذی استعداد علما سے حاصل کی، تحصیلداری کے عہدہ پر فائز تھے، منیرؔ شکوہ آبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی، ترکیب بند، سلام نوحہ، مرثیہ، غرض تمام اہم اصناف سخن میں زور طبع دکھاتے تھے، سنگلاخ زمینوں اور مشکل طرحوں میں طبیعت کی تیزی اور بڑھ جاتی تھی، الہ آباد کے کامل الفن اور مسلّم الثبوت استاد شمار ہوتے تھے[3]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:۔

خنجر یار پس ذبح جو چمکت نکلا
آستین رگ جاں سے ید بیضا نکلا

دل سے میرے نہ خیال قدِ یار گیا
نہ کبھی پائے تصور سے یہ کانٹا نکلا

---

[1] خمخانۂ جاوید، ج ۴ ص ۸۰ [2] ایضاً ص ۵۰۱ [3] چراغ محفل فصاحت ص ۶۵ - ۶۶

جسے دیکھا اسی کے پردے میں تو ہی نظر آیا
ہر اک جامہ نہایت ٹھیک تیرے جسم پر آیا

یہ تو سچ ہے کہ میری آہ میں تاثیر نہیں
دونوں ہاتھوں سے جگر کس نے سنبھالا اپنا

عالی ہیں جنکے ظرف منور ہیں انکے دل
قلعی ہوئی نہ ساغر خورشید و ماہ پر

دل کی کشش اگر ہے سلامت تو دیکھنا
لائیں گے کھینچ کر تمھیں اک روز راہ پر

آئی خدا کی یاد دم واپسیں تو کیا
آنکھیں کھلیں تو وقت نماز سحر نہ تھا

برسوں بتوں کے عشق میں تقدیر سے لڑا
بندہ ادھر رہا کہ خدا بھی جدھر نہ تھا

بھڑکا دیا ہوائے تمنائے وصل نے
اتنا بلند شعلہ داغ جگر نہ تھا

یہ کیا ہوا کہ بیٹھ گئے دل کو تھام کے
پھر کیسے تیرے نالۂ دل میں اثر نہ تھا

کعبہ میں شمع، دل میں چمک، دیر میں چراغ
نور جمال یار کہاں جلوہ گر نہ تھا

مولوی وحید احمد وحیدؔ مولوی امیر اللہ کے بیٹے اور کٹرا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے، اپنے عہد کے الہ آباد کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اور حضرت اکبر الہ آبادی کے استاد تھے، ان کے کلام کا ایک مجموعہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، رنگ کلام حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوگا[1]۔

آج ہر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

لائے گی کس طرح سے کبھو بوئے پیرہن
اس کی گلی میں جا کے صبا اور ہو گئی

شاہ محمد بشیر بشیرؔ منیر شکوہ آبادی کے ایک دوسرے الہ آبادی شاگرد تھے، بہت پرگو اور خوش مزاج بزرگ تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے[2]، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

ہم پاؤں اٹھائے ہوئے صحرا میں چلے گے
کانٹوں نے اگر بوجھ سنبھالا کف پا کا

---

[1] چراغ محفل فصاحت ص ۶۵ [2] ایضاً ص ۶۶

سید عزیز الدین حیدر افسر الہ آبادی (ولادت ۱۸۴۲ء) وحید احمد وحید کے شاگرد، اکبر کے ہم مشق اور الہ آباد کے خوش فکر شاعر تھے، آخر عمر میں نابینا ہوگئے تھے[۱]، رنگ کلام حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوگا،

مختار بھی مجبور بھی کاموں میں بشر ہے ... اس سے یہ سزا اور جزا ہے بھی نہیں بھی

میں آپ کی کس بات کو سچ جانوں کہ جھوٹ ... الفت کو جو پوچھا تو کہا ہے بھی نہیں بھی

یوں آنکھ تم نے بدلی ہنستے ہی ہنستے مجھ سے ... کچھ واسطہ ہی گویا ہوگا، نہ تھا، نہ اب ہے

رحمت نے تیری دی ہے مجھ کو امید بخشش ... خوف جزائے فردا ہوگا، نہ تھا، نہ اب ہے

کیوں تم کو اس سے افسر امید ہے وفا کی ... وہ بے وفا کسی کا ہوگا، نہ تھا، نہ اب ہے

خان بہادر اکبر حسین اکبر الہ آبادی جو نہ صرف الہ آباد کے مسلم الثبوت استاد تھے بلکہ اردو شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے، ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے، ان کے والد ایک تارک الدنیا درویش ہوگئے تھے، اس لیے اکبر کو عربی و فارسی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اوائل عمری میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ تعمیرات میں ملازمت اختیار کرنا پڑی لیکن جلد ہی انھوں نے یہ نوکری چھوڑ کر قانون پڑھنا شروع کر دیا، ۱۸۶۶ء میں انھوں نے مختاری کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار کے عہدہ پر فائز ہوئے، ۱۸۷۲ء میں وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وکالت شروع کی جس کا سلسلہ ۱۸۸۰ء تک جاری رہا، ۱۸۸۱ء میں منصفی کا عہدہ مل گیا جس سے ترقی کرکے ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوگئے، ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہمہ تن ادبی خدمات میں مشغول ہوگئے اور ۱۹۲۱ء میں ۷۵ سال کی عمر میں الہ آباد میں وفات پائی، اکبر الہ آبادی ایک عدیم المثال شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے

[۱] خمخانۂ جاوید، جلد اول ص ۳۵۰

اردو شاعری میں ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی جس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے، اور جس کی نمایاں خصوصیت اور مقصد طنز و ظرافت کے ذریعہ بظاہر نظر فریب لیکن حقیقتاً کھوکھلی مغربی تہذیب و سیاست پر تنقید اور اس کے مضر اثرات سے اپنی قوم کو بچانا اور معاشرہ کی اصلاح کرنا تھا،[۱] اکبر کے کلام کے کئی مجموعے بار بار شائع ہو چکے ہیں، اور ان کا کلام اپنی مقبولیت کی وجہ سے تعارف کا محتاج نہیں ہے، پھر بھی ان کے چند شعر بطور تبرک درج کیے جاتے ہیں:

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو ... بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات

بسکہ تھا نامۂ اعمال میرا ہندی میں ... کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

جان لینے ہی کی حکمت میں ترقی دیکھی ... موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

تیری تنخواہ بڑھی شکر ہے لیکن اے دوست ... تیری توقیر نہ ترقی ہوئی تنخواہ کے ساتھ

عادت جو پڑی ہو ہمیشہ سے وہ دور بھلا کب ہوتی ہے ... رکھی ہے چنوٹی پاکٹ میں پتلون کے اندر دھوتی ہے

قتل سے پہلے ہے کلور و فارم ... شکر ہے ان کی مہربانی کا

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب ... بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے

سایہ کی بھی سن ہوس انگیز ہے لیکن ... اس شوخ کے گھنگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

ہوئے اسقدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا ... کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا ... جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں ... حجاب ان کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

تاکید عبادت پہ ہے اب کہتے ہیں لڑکے ... پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی ... شاید بڑے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

[۱] جدید شعرائے اردو ص ۵۶

تعلیم لڑکیوں کو ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جنکو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مطبوعہ کلیات کے علاوہ اکبر کا اب بھی بہت سا کلام ایسا ہے جو منظر عام پر نہیں آیا ہے، اکبر کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہا کرتے تھے جس کی مثال حسب ذیل اشعار ہیں:

سیا سا در ہجوم جلوۂ دنیا کرمی بینم
سکون یک نفس سرمایۂ صد اضطراب اینجا

زقرآں بے خبر مشیں و از عقبیٰ مشو غافل
چہ خوش گفت اکبر خوشگو حساب انجا کتاب اینجا

ان شعرا کے علاوہ اس دور میں اور بھی بہت سے شاعر گزرے ہیں، جن میں سید غلام مصطفےٰ آثم تعلقدار مصطفےٰ آباد، احمد علی احمد سکندرہ کے باشندے اور الہ آباد میں سررشتہ دار تھے۔ مولوی نورالدین حسین اصل میں امیٹھی کے رہنے والے تھے، لیکن الہ آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ لالہ سبج رام اسان اور باقر خاں باقر شہر الہ آباد کے باشندے تھے، سید زین العابدین بیمار الہ آباد کے رہنے والے اور عدالت میں سررشتہ دار تھے، محمد خاں پریشان اور محمد جعفر جعفری کا بھی وطن الہ آباد تھا، لیکن آخر الذکر ترک سکونت کر کے اجمیر چلے گئے تھے، سید اسرار علی جواد اور میر جعفر علی جوان کا بھی وطن الہ آباد تھا، سید قدرت علی جولاں الہ آباد کے ریختی گو شاعر تھے، مرزا جان حبیب کا وطن الہ آباد تھا، لیکن قنوج میں سکونت اختیار کر لی تھی، مولوی احمد حسین رقم کڑے کے رہنے والے تھے، صاحب علی خاں صاحب اور منشی کمال الدین عنو کا بھی وطن الہ آباد تھا، لیکن آخر الذکر عموماً دلی میں رہتے تھے، میر الہ داد خواہش بھی اگرچہ الہ آباد کے باشندے تھے لیکن قیام دلی میں رہتا تھا، مکھن لال عاقل الہ آباد کی کلکٹری میں ملازم تھے، مدار بخش عیاش موضع منہاج پور کے زمیندار تھے، منا نند فرحت عدالت منصفی الہ آباد میں وکیل تھے، عبد القادر قادر الہ آباد خاص کے باشندے تھے، حوب اللہ قاصر

بجی پور ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے، سید احمد جان کامل شاہ اجمل کے پوتے تھے، سید فتح علی کیوان الہ آبادی ناسخ و آتش کے شاگرد تھے، سید مبارک علی مبارک شاہ غلام اعظم افضل کے شاگرد تھے، چندی سہائے مبتلا اصل میں پرتاب گڑھ کے باشندے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت الہ آباد میں مقیم رہے، میر باسط علی محوی الہ آبادی تھے لیکن کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، شیخ علی بخش مضطر اور مرزا مہدی مہدی الہ آباد کے باشندے تھے، سید محمد عسکری کڑے کے رہنے والے تھے، اور شاہ غلام اعظم افضل کے شاگرد تھے، مولوی برہان الدین نزہت قصبہ دیوی ضلع الہ آباد کے متوطن تھے، میر ضامن علی وجیہ، سید وزیر علی وزیر اور شنکر لال وفا بھی الہ آباد کے باشندے تھے، محمد مراد خاں ولا اور سید محمد مہدی ہادی اور چندن سہائے عظم بھی الہ آباد کے رہنے والے تھے، لیکن آخر الذکر بسلسلۂ ملازمت غازیپور میں مقیم ہو گئے تھے، اور دیوکی نندن ہنر الہ آباد کلکٹری میں ملازم تھے، لیکن ترک ملازمت کر کے گوالیار چلے گئے تھے۔[1]

الہ آباد کی شاعری کا پانچواں دور موجودہ صدی کے شعرا پر مشتمل ہے، اگرچہ اس میں کچھ وہ شاعر بھی شامل ہیں جن کی عمر کا ابتدائی زمانہ انیسویں صدی کے آخری حصہ میں گزرا ہے، اردو شاعری میں اصلاحی تحریک کا اثر اس دور کے الہ آباد کے شعرا پر بھی پڑا، اور شعر کی ظاہری زیب و زینت کے بجائے معنی کی طرف بھی شعرا کی توجہ ہونے لگی، غزل کی مقبولیت اس دور میں بھی باقی رہی، لیکن قصیدہ کی اہمیت کم ہو گئی اور اس کی جگہ نظم جدید نے لے لی، موجودہ دور میں اردو شاعری کو ہندی شاعری کے قریب لانے کے لیے بھی یہاں تجربے ہو رہے ہیں، اور عام فہم ہندی الفاظ کو اردو میں جگہ دے کر اس کو وسیع کرنے کی کوشش جاری ہے، ان تجربات میں حضرت فراق پیش پیش ہیں، اس زمانہ میں خود اس ضلع میں جلیل اور نوح جیسے خوش فکر شاعر پیدا ہوئے اور ناصری اور اصغر جیسے اساتذہ یہاں دوسری جگہوں سے آئے اور یہاں کے شاعرانہ

---

[1] چراغ محفل فصاحت

ماحول میں نئی جان پیدا کی، اس عہد کا ایک اہم واقعہ ۱۹۲۴ء میں دار الحکومت کا الہ آباد سے لکھنؤ منتقل ہونا ہے لیکن اس کا یہاں کے ادبی ماحول پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور اس دور میں بھی یہاں شعراء کی بڑی تعداد پیدا ہوئی ہے، جس میں سے چند مشہور شعراء کے نام یہ ہیں:

جلیل احمد جلیل مانک پوری ۱۸۶۹ء میں مانک پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ آئے، یہاں اعلی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم عروض و زبان دانی میں مہارت پیدا کی اور بیس سال کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے، امیر نے جب رامپور میں امیر اللغات کا دفتر قائم کیا، تو جلیل کو اس کا سکریٹری مقرر کیا، ۱۹۰۰ء میں جب امیر حیدرآباد گئے تو جلیل بھی ان کے ساتھ دکن چلے گئے، اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے مہمان ہوئے، ۱۹۰۵ء میں جب داغ کا انتقال ہوا تو میر محبوب علی خاں جلیل کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ اور انھیں جلیل القدر کے خطاب سے نوازا، میر عثمان علی خاں نے فصاحت جنگ کا خطاب اضافہ کیا، پھر امام الفن کے خطاب سے مزید نوازا، جلیل نے حیدرآباد میں باعزت زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں وفات پائی، شعر و شاعری کے ساتھ جلیل دوسرے علمی و ادبی کاموں میں بھی مشغول رہتے تھے، حیدرآباد پہنچنے کے بعد انھوں نے دو رسالوں محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی کی ترتیب و اشاعت کی خدمت انجام دی، ۱۹۱۸ء میں تذکیر و تانیث کے موضوع پر ایک نہایت عمدہ اور ضخیم کتاب تصنیف کی جو عبد الحلیم شرر کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی، پھر اختر مینائی کے ساتھ مل کر دکن کی ایک تاریخ لکھی، ان کے علاوہ اپنے استاد امیر مینائی کے حالات زندگی بھی لکھے جو کتابی شکل میں ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے، جلیل کا مرتبہ دور جدید کے غزل گویوں میں بہت بلند ہے، اور وہ صحیح معنوں میں امیر کے جانشین تھے، ان کا مجموعۂ کلام جان سخن کے نام سے شائع ہو چکا ہے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

۱؎ جدید شعرائے اردو (مصنفہ ڈاکٹر عبدالوحید) ص ۲۳۲

شراب عشق کی مستی عجیب مستی ہے — گیا جو ہوش تو پھر عمر بھر نہیں آیا

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

وہ شوق بھرا دل تھا حسرت سے تڑپ اٹھا — ثابت نہ ہوا مجھ پہ ذرا دل کا خطا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ لیکن یہ گذارش ہے — جب یاد ہم آ جائیں ملنے کی دعا کرنا

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں — وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی — کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

آتے آتے ان کو آئے گا خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

دل کی خوشی یہ ہے کہ لڑے آنکھ یار سے — اس پر نظر نہیں کہ وہ جادو اثر بھی ہے

شوخی بھی ہر نگاہ میں شرم و حیا کے ساتھ — آنکھ اسکی پردہ دار بھی ہے پردہ در بھی ہے

وہ اٹھے درد اٹھا حشر اٹھا — مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

جلیل کے برادر بزرگ خلیل بھی امیر مینائی کے شاگرد تھے اور تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے تین چار دواوین کے علاوہ متعدد مثنویوں اور بہت سے قصائد کے مصنف ہیں، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

تم ہو، میں ہوں، گلا ہے، خنجر ہے — اب بھلا انتظار کس کا ہے

نہ جلاؤ نہ جلاؤ مری تربت پہ چراغ — حاجت شمع نہیں داغ جگر کے ہوتے

اس دور کے دوسرے بڑے بڑے شاعر حضرت نوح ناروی ہیں، وہ ۱۸ ستمبر ۱۸۸۹ء میں اپنے ننہالی قصبہ بھوانی پور ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے لیکن پرورش اپنے وطن نارہ میں پائی، میر نجف علی سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، شعر و شاعری کا شوق بھی استاد ہی کی صحبت میں پیدا ہوا اور ابتدا میں ان ہی سے اشعار پر اصلاح لی، پھر امیر اور جلال لکھنوی کو کلام دکھانے لگے لیکن بعد کو داغ کے شاگرد ہو گئے، ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد گئے، لیکن داغ کے انتقال

کے بعد وہاں سے واپس آگئے، اور اپنی خاندانی جائداد کی دیکھ بھال اور شعر و شاعری میں مشغول رہے، یہاں تک کہ ۱۹۶۳ء میں وفات پائی، نوح ناروی عہد جدید کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں، خود ان کے بیان کے مطابق ۱۹۴۱ء میں ان کے شاگردوں کی تعداد چار سو سے کم نہ تھی، جن میں چالیس پچاس بہت اچھے کہنے والے تھے، اور ان میں سے چند صاحب دیوان اور صاحب تلامذہ بھی تھے، نوح کی زبان اور انداز بیان بہت کچھ داغ سے ملتا ہے، لیکن ان کے یہاں وہ شوخی جو داغ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے مفقود ہے، پھر بھی ان کے کلام میں ان کی انفرادیت موجود ہے، نوح کے تین دیوان سفینۂ نوح، طوفان نوح اور اعجاز نوح مرتب ہوئے ہیں، جن میں سے دو اول الذکر شائع بھی ہو چکے ہیں،[1] رنگِ کلام ملاحظہ ہو:

ادا آئی، جفا آئی، غرور آیا، حجاب آیا
ہزاروں آفتیں لیکر حسینوں کا شباب آیا

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد
ملی زندگی مجھکو مرنے کے بعد

کچھ مروت کچھ محبت چاہیے
یہ نہیں تو کچھ نہیں انسان میں

آپ ہیں ہم ہیں مے ہے ساقی ہے
یہ بھی اک امر اتفاقی ہے

ہو گئیں ختم ہجر کی گھڑیاں
اور تھوڑی سی رات باقی ہے

ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا
جہاں بیٹھے گھٹا اٹھی جہاں پہنچے بہار آئی

مرا خیال حق میں معراج زندگی ہے
دار و رسن سے سنیے منصور کا فسانہ

رنگینیٔ عالم کی برعکس یہ تصویریں
سو گل ہیں مگر عالم ہر گل کا جدا گانہ

ہو اگر ذوق نظر تو کیا ہے جلووں کی کمی
لاکھ پردوں میں ضیائے شمع عرفاں دیکھئے

بعد فنا مزار سیرہ گزر رہنا
جب ہم بگڑ گئے تو ہمارا یہ گھر بنا

۱؎ جدید شعرائے اردو ص ۳۴۰

واعظ بھی مست بادہ و پیمانہ ہو گیا
ظاہر کمال ساقی میخانہ ہو گیا

بدل کر بھیس ارمان دل مضطر نکلتے ہیں
ادا ہو کر سماتے ہیں دعا بنکر نکلتے ہیں

تجویز کی تھی آپ نے جس پر سزائے موت
تقصیر مرتے وقت بھی مجھسے وہی ہوئی

اصغر حسین اصغر گونڈوی اس عہد کے تیسرے مشہور شاعر ہیں جن کا الہ آباد سے گہرا تعلق ہے، ان کا اصل وطن گورکھپور تھا، جہاں وہ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے لیکن اوائل عمر ہی میں اپنے والد کے ساتھ وہ گونڈے چلے آئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، تعلیم اگرچہ مسلسل نہ ہوئی لیکن اپنی ذاتی کوشش سے انھوں نے اچھی خاصی عربی و فارسی کی لیاقت پیدا کر لی تھی، شاہ عبد الغنی منگلوری کی ارادت کی وجہ سے ان کی طبیعت میں تصوف کا ذوق پیدا ہو گیا تھا جس کا رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے، وہ ابتداءً گونڈہ میں چشمہ سازی کا کام کرتے تھے، لیکن بعد کو الہ آباد چلے آئے تھے اور ہندستانی اکیڈمی کے تماہی رسالہ ہندستانی کے اڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے، اصغر کے الہ آباد کے قیام کی مدت طویل ہے، یہیں انھوں نے ۱۹۳۶ء میں وفات پائی، اصغر کا شمار دور جدید کے بہترین غزل گو شعراء میں ہوتا ہے، ان کے دو مجموعے نشاط روح اور سرود زندگی شائع ہو چکے ہیں،[1] نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بیخود نہ ہوشیار ہوا

ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ کچھ بقا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرز ادا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوق عمل خود ہے گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہاں صیاد ہوتا ہے

۱؎ جدید شعرائے اردو ص ۴۵۵ - مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۷۷

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

اس عہد کے چوتھے بڑے شاعر جن کا الہ آباد سے بہت گہرا تعلق ہے، رگھوپتی سہائے فراق ہیں، وہ ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے، میور سنٹرل کالج سے گریجویٹ ہونے کے بعد آئی سی ایس میں نامزد ہوئے، لیکن انھوں نے قومی کاموں کو سرکاری ملازمت پر ترجیح دی اور کانگریس کی تحریک میں شریک ہو کر قید و بند کے مصائب جھیلتے رہے، ۱۹۲۷ء میں رہا ہونے کے بعد لکھنؤ کرسچن کالج میں ملازمت کر لی، پھر سناتن دھرم کالج کانپور میں اردو لکچرر ہوئے، اس زمانہ میں انھوں نے انگریزی میں ایم اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں لکچرر ہوئے، اس وقت سے ان کا مستقل قیام الہ آباد میں ہے، رٹائر ہونے کے بعد گذشتہ چند سال سے ہمہ تن خدمت ادب میں مشغول ہیں، فراق کی ابتدائی غزلوں میں امیر کا رنگ ہے، پھر عزیز و صفی کے رنگ میں کہنے لگے، پھر رفتہ رفتہ خود ان کا ایک رنگ ہو گیا، جس کو فراق کا طرز کہا جا سکتا ہے، جہاں تک انکی رباعیوں کا تعلق ہے بقول نیاز فتحپوری "فراق نے اس صنفِ سخن میں لطیف ترین بت گری سے کام لیا ہے، ان کی رباعیوں میں مغربی کلچر بھی ہے اور ایرانی کلچر بھی، یونانیوں کا جمالیاتی نظریہ بھی ان میں موجود ہے، قدیم ہندوا اور بودھ آرٹ کا رقص و نغمہ بھی"۔ فراق کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں رمز و کنایات، شبنمستان اور غزلستان صرف غزلوں کے اور روپ محض رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ روحِ کائنات اور نغمۂ گل ان کی نظموں اور غزلوں کے اور مشعل غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے[1]۔ ان کے علاوہ اردو میں عشقیہ شاعری، اردو غزلگوئی، حاشیے اور اندازے

[1] جدید شعرائے اردو ص ۶۰۰

ان کے تنقیدی اور دیگر مضامین کے مجموعے ہیں، ان کو حال ہی میں ساہتیہ ایکاڈمی کی طرف سے نغمۂ گل پر انعام بھی مل چکا ہے، ان کی غزلیں، رباعیاں اور نظمیں تعارف کی محتاج نہیں ہیں، پھر بھی ان کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

دل میں اٹھا کے رکھ لے گلستاں
کر لے علاجِ تنگیٔ داماں

آئے گنہگارانِ محبت
نادم نادم نازاں نازاں

کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا
کون ہے صبحِ ازل سی خراماں

رکی رکی سی شبِ تار ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

زندگی کو وفا کی راہوں میں
موت خود روشنی دکھاتی ہے

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انساں کے ہاتھوں سے انساں پہ کیا گزری

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو درِ خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے

کشتیٔ دل بچایئے، اتنا مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو پار لگے تو ڈوب جائے

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے
در و دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ یہ موج یہ ترنم یہ نکھار
بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

یہ وہ شعرا ہیں جن کی شہرت دنیائے اردو کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی ہے، ان کے علاوہ

اس دور میں الٰہ آباد میں بہت سے دوسرے شاعر بھی پیدا ہوئے، جن کی تخلیقات شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، واجد حسین واجد (پیدائش ۱۸۶۱ء وفات ۱۹۳۶ء) الٰہ آباد کے ایک معزز رئیس اور رشک کے شاگرد صادق حسین خاں صائب کے شاگرد تھے، عربی و فارسی کی اچھی لیاقت رکھتے تھے، آخری عمر میں صرف سلام و قصیدے کہنے لگے تھے، نوازش حسین سید (پیدائش ۱۸۶۸ء) ہائی کورٹ میں ملازم تھے، نثر و نظم میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے کلام میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے۔

عبد الباسط خاں تفتہ (پیدائش تقریباً ۱۸۶۳ء وفات ۱۹۳۳ء) راجہ پور کے باشندے اور آخگر کے شاگرد تھے، شیخ رحمت اللہ رحمت (پیدائش تقریباً ۱۸۷۱ء) صاحب دیوان تھے، غزل، سلام، نوحہ، نعت، منقبت، دادرا، ٹھمری سب ہی کچھ کہتے تھے، سید مرتضیٰ حسین شفق (پیدائش ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء) عماد پور میں پیدا ہوئے، لیکن الٰہ آباد کو وطن ثانی بنالیا تھا، امیر مینائی کے شاگرد تھے، اور خود استادوں میں شمار ہوتے تھے، غزلوں کے دو دیوانوں کے علاوہ رباعیوں کا ایک مجموعہ خزینۂ رباعیات، ایک مثنوی مرقع حاضرہ اور قصیدوں اور نظموں کے ایک ایک مجموعے کے مصنف ہیں، خزینۂ رباعیات اور مرقع حاضرہ شائع بھی ہوچکی ہیں، ان کے علاوہ فن عروض میں مہر عروض، رکن عروض اور تحقیق سخن بھی ان کی تصانیف ہیں[1]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

چمکے گی برق طور جمال حبیب سے
کہہ دو کلیم ہٹ کے کھڑے ہوں قریب سے

شفق بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہوگیا
کہ دل تھام کر تم ٹہلنے لگے

قیامت ہے نہیں کم انتظار وصل کی مدت
خدا جانے کہیں وعدہ وفا ہوتا تو کیا ہوتا

شفق ہے نیستی پر بھی بشر کو دعویٰ ہستی
نہ ہونے پر یہ عالم ہے بھلا ہوتا تو کیا ہوتا

کچھ زاہد کچھ مقدر کچھ فلک بدنام ہے
ڈر کے مارے نام لے کون اس ستم ایجاد کا

[1] خمخانۂ جاوید، جلد پنجم ص ۸، چراغ محفل فصاحت ص ۹۶

فرشتے ملتے ہیں، انسان ہی نہیں ملتا
خدا ملے تو ملے آدمی نہیں ملتا

شفق جو دل میں ہے آنکھوں میں ہے نگاہ میں ہے
اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں وہی نہیں ملتا

چھپ چھپ کے شفق تھوڑی سی پی لیتا ہے واعظ
کمبخت نہیں چھوٹتی عادت بھی ہے کیا چیز

ایک نیا خطاب دیں حسن کی ہر ادا کو ہم
پیار کہیں ستم کو ہم لطف کہیں جفا کو ہم

ہو فرشتہ شفق یہ بات ہے اور
جو نہ انساں ہو آدمی ہی نہیں

چڑھ جاؤگے نظروں پہ اتر جاؤگے دل سے
ہر شخص کی آنکھوں میں سمانا نہیں اچھا

سائنس کو مذہب کا پتہ ہی نہ ملا
الجھے ہوئے ڈورے کا سرا ہی نہ ملا

سب راز کھلے راز خدا ہی نہ ملا
عقدہ تو ملا عقدہ کشا ہی نہ ملا

دیر و حرم کے پھیر میں اپنا بھرم گنوائے کیوں
گھر ہو جو بے نیاز ہو در پہ کسی کے جائے کیوں

غم کا مستحق وہی جس کو نصیب ہو خوشی
جو نہ ہنسا ہو عمر بھر کوئی اسے رلائے کیوں

تو جو سنے نہ التجا دست نگر ہو کیوں ترا
جب نہ قبول ہو دعا ہاتھ کوئی اٹھائے کیوں

ٹوٹا بھی تو کعبہ کی بنا ڈال کے ٹوٹا
بگڑا تو بنا اور بھی بتخانہ ہمارا

اختر ہاشمی (ولادت ۱۸۷۵ء) مرتضیٰ حسین شفق کے شاگرد تھے، اصل میں میرٹھ کے رہنے والے تھے، لیکن خود بسلسلۂ ملازمت الٰہ آباد آئے اور مستقل سکونت اختیار کرلی، سید محبوب حسین تحمل کراری ضلع الٰہ آباد کے باشندے تھے، الٰہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، حضرت نیساں الٰہ آبادی کے ممتاز شاگرد تھے، اور خود استادوں میں شمار کیے جاتے تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

الفت کا ایک جذبۂ بے اختیار تھا
جس پر حیات و موت کا دار و مدار تھا

تھی سامنے شراب مگر پی نہ سکا میں
اب کیا کہوں کہ جبر تھا یا اختیار تھا

ساقی کا احترام کیے جارہا ہوں میں
تقویٰ کو نذر جام کیے جارہا ہوں میں

ان کو تھا ناگوار جو افسانۂ حیات   قصہ ہی وہ تمام کیے جا رہا ہوں میں

پردہ ہجر بیخودی کا خطائے نظر نہیں   وہ سامنے ہیں اور مجھے کچھ خبر نہیں

رنگینیٔ شباب چمن دیکھتے ہیں سب   انجام حسن گل پہ کسی کی نظر نہیں

سید حامد علی حامد مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے، لیکن الہ آباد میں بسلسلۂ ملازمت قیام پذیر تھے، شاعری کی ہر صنف پر قادر، فن شعر سے واقف اور مسلم الثبوت استاد تھے، مجمع الفوائد، بحر الفوائد، داستان عجم وغیرہ کتابوں کے مصنف بھی تھے، نمونۂ کلام یہ ہے:

گلی میں یار کی جا کر سر مزار آئے   مگر وہاں گئے پیدل یہاں سوار آئے

اثر نہ جلوۂ جاناں کا ہو کہیں معدوم   جو عشق ہی آیا تھا موسیٰ تو بار بار آئے

یوسف حسین طاہر منیا برج میں پیدا ہوئے، ۱۸۹۷ء میں الہ آباد آئے اور مستقل یہاں مقیم ہو گئے، حامد علی حامد سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور غزلوں کے علاوہ سلام، قصیدہ وغیرہ بھی کہتے تھے،

مرزا محمد محسن محسن (ولادت تقریباً ۱۸۸۱ء وفات ۱۹۴۱ء) میونسپل بورڈ الہ آباد میں پیشکار تھے، اردو فارسی کی قابلیت اچھی تھی، نمونۂ کلام درج ذیل ہے،

اس چشم مست ناز کی اللہ ری مستیاں   دو رند ہیں کہ جھوم رہے ہیں پئے ہوئے

سمجھے نہ سمجھے کوئی مگر رہرو عدم   جاتے ہیں فاش پردۂ دنیا کیے ہوئے

محسن زماں خاں محسن منیاں الہ آبادی کے شاگرد تھے، غزلوں کے علاوہ قطعات و رباعیات بھی کہتے تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

جگر و دل فگار ہیں دونوں   اک نظر کے شکار ہیں دونوں

کچھ نہیں ہستیٔ گل و بلبل   ایک مشتِ غبار ہیں دونوں

جلوۂ حسن و آتشِ الفت   دشمن قلب زار ہیں دونوں

دل، جگر وقف نشاط و غم رہے   زندگی بھر کشمکش میں ہم رہے

پنڈت پرتھوی ناتھ شوق پنڈت نرنجن ناتھ مشتاق، مولف تذکرہ چمنستان کشمیر کے بیٹے، کشمیری برہمن اور الہ آباد کے باشندے تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے،

مایوسیاں ہیں، میں ہوں، ضبط غم نہاں ہے   جو سن سکے نہ کوئی وہ میری داستاں ہے

نہ وہ بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی   تو کیونکر اعتبار انقلاب آسماں پھر ہو

یہ چار تنکے ہی بس کائنات ہیں اپنی   قفس میں ڈال نہ صیاد آشیاں سے ہمیں

تڑپ نصیب ہوئی سوزش نہاں سے ہمیں   وفور غم میں تسلی ملی فغاں سے ہمیں

ارشاد حسین ارشاد محلہ دریا آباد الہ آباد کے باشندے تھے، سب رجسٹرار کے عہدے سے پنشن پائی، منیاں الہ آبادی کے شاگرد تھے، مدحیہ قصیدے اور غزلیں خوب کہتے تھے، قطعات، سلام، نوحہ و مرثیہ بھی کہا کرتے تھے، محمد علی ناصر (پیدائش ۱۸۸۳ء) بھی الہ آباد کے باشندے اور منیاں کے شاگرد تھے، وہ کہنہ مشق شاعر تھے اور ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

فصل بہار کیا ہے؟ کیا موسم خزاں ہے   اک ہے خوشی کا قصہ اک غم کی داستاں ہے

آئیے دل میں بہار داغ ہجراں دیکھئے   زندگی بھر کی ریاضت کا گلستاں دیکھیے

سید محمد متین متین کڑے کے باشندے اور منیاں کے شاگرد تھے، فکر بلند و طبع رسا رکھتے تھے اور فارسی، عربی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، تقریباً تمام اہم اصنافِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے، دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن لاہور کے مشہور رئیس تھے، الہ آباد میں عرصہ تک قیام پذیر رہے، ان کے اشعار میں عموماً پند و نصیحت کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے، گلشن کا ایک مجموعۂ کلام طبع ہو چکا ہے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

آنے کی اک تھکن ہے جانے کی اک مہم ہے   دم لیتا ہے مسافر مہماں سرائے تن میں

کثرت میں دیکھتے ہیں وحدت کا رنگ گلشن
رونق ہے ایک گل ہوں گو سیکڑوں چمن میں

شاہ محمد عثمان محب (پیدائش ۱۸۷۷ء وفات ۱۹۲۷ء) شیخ محب اللہ الہ آبادی کے خاندان میں سے تھے اور افسر الہ آبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

جان بھی دیں حضرت عیسیٰ تو کیا
آپ کا بیمار اچھا ہو چکا

وسیلہ ہم سے بخشش کا اگر پوچھا تو کہہ دیں گے
ہمارے واسطے یہ الفت شبیر کیا کم ہے

میر سجاد علی سجاد (متوفی ۱۹۳۲ء) شہر الہ آباد کے رئیس تھے، علوم متداولہ میں پوری دستگاہ رکھتے، فارسی ادبیات سے زیادہ شغف تھا، اردو میں شعر کہنے کے علاوہ ہر سال ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

الفت میں رنگ لائے ہیں مٹ کر جگر کے داغ
اجڑے ہوئے چمن کی بھی دیکھو بہار کو

میں چاہتا ہوں نالہ باندازِ نو کروں
طرز فغاں چمن میں سکھا دوں ہزار کو

دنیا سے یوں مٹایئے سجاد کا نشان
ڈھونڈھے اگر کوئی تو نہ پائے مزار کو

مہدی علی ناصری، ۱۸۸۵ء میں فتحپور ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے، ۱۹۱۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایف اے پاس کیا، ۱۹۱۳ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد میور سنٹرل کالج میں عربی و فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے اور تقریباً دس سال تک الہ آباد میں علمی و ادبی خدمت میں مشغول رہے، ۱۹۲۲ء میں الہ آباد سے گورنمنٹ ہائی اسکول لکھنؤ میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر چلے گئے، ۱۹۲۴ء میں بارہ بنکی آئے اور ۱۹۲۹ء تک وہاں رہے، پھر علی گڑھ تبادلہ ہوا اور ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا، پروفیسر ضامن صاحب نے ناصری خلد بریں کو پہنچے، تاریخ وفات نکالی، ناصری صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں: مخزن الفوائد، حمرات، زینت وحش وطیر، منصور کی سرگذشت، صنادید عجم، دیوان حصہ اول (نذر احباب) دیوان حصہ دوم اور قصائد۔

اعجاز حسین خاں اعجاز، ۱۸۹۲ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے، نیساں الہ آبادی سے تلمذ تھا لیکن انکی وفات کے بعد عزیز لکھنوی سے اصلاح لینے لگے، سید ضامن علی ضامن ۱۸۹۴ء میں مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے، علوم مشرقیہ لکھنؤ میں حاصل کیے، ایف اے آگرہ سے اور بی اے اور ایم اے الہ آباد سے پاس کیا، ابتداءً ہائی کورٹ میں بحیثیت مترجم ملازم ہوئے، پھر کرسچن کالج الہ آباد میں فارسی کے لکچرر ہوگئے، ناصری صاحب کے الہ آباد چھوڑنے کے بعد انکی جگہ یونیورسٹی میں ضامن صاحب کا تقرر ہوگیا اور ۱۹۲۴ء میں جب یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کھلا تو وہ اسکے صدر مقرر ہوئے، حضرت نیساں الہ آبادی سے مشورہ سخن کرتے تھے لیکن انکے انتقال کے بعد ناسخ کا رنگ ترک کر کے عام فہم شعر کہنے لگے[1]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے؛

دنیا میں پھر وہ کام کے قابل نہیں رہا
جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

عبث ہے دیر و حرم کا جھگڑا وہ ہر جگہ ہے کہاں نہیں ہے
عیاں ہے جتنا وہ چھپنے والا نظر سے اتنا نہاں نہیں ہے

تیری نگاہوں نے لے لیا دل مگر خلش درد کی ہے باقی
طلسم طرفہ ہے یہ محبت مکیں تو ہے یاں مکاں نہیں ہے

کلی کلی مسکرا رہی ہے ترانے قمری بھی گا رہی ہے
تمھیں کو کیا ہو گیا ہے ضامن جو نالہ و فغاں نہیں ہے

شوق دیدار رخ یار الٰہی توبہ
آج ہم غیر کا پیغام لیے جاتے ہیں۔

الہ یار خاں بریاں (متوفی ۱۹۳۶ء) عزیز الدین افسر کے شاگرد تھے، بعد میں نوح ناروی سے اصلاح لیتے تھے، ۱۹۳۷ء میں ان کا ایک دیوان یادگار بریاں کے نام سے شائع ہوا، منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی نوح ناروی کے جانشین اور دور جدید کے الہ آباد کے اساتذہ میں ہیں، صاحب دیوان شاعر ہیں، سید محمد رضا بیدل عزیز لکھنوی کے شاگرد اور الہ آباد کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں، زیادہ تر غزلیں اور قصیدے کہتے ہیں، ابو الحسن توکل قصبہ کراری ضلع الہ آباد کے باشندے تھے اور صرف قصیدہ کہتے تھے، پنڈت رام ناتھ آغا الہ آباد کے باشندے اور پنڈت برج ناتھ چکبست لکھنوی کے شاگرد تھے نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

اگر بے فیض جینا ہے تو کیا حاصل بشر ہو کر
شجر ممتاز ہوتا ہے چمن میں بار ور ہو کر

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۳۸

کسی کے حسن عالم سوز کا یہ اک کرشمہ ہے
جلایا خرمنِ ہستی مرا برقِ نظر ہو کر

پنڈت جگموہن ناتھ شوق ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھے، کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر تھے، شمیم تجلی [illegible] صاحبِ دیوان شاعر تھے، نثار حسین خاں شیدا گورنمنٹ پریس میں ملازم تھے، الٰہ آباد کے کہنہ مشق ریختی گو تھے، انکا دیوان موسوم بہ آرسی شائع ہو چکا ہے، شیام بہادر اثر خواجہ پور ضلع الٰہ آباد کے باشندے تھے، لیکن مستقل سکونت الٰہ آباد میں اختیار کر لی تھی، نمونۂ کلام یہ ہے:

لاکھ پردوں میں ترا حسنِ خود آرائی ہے
پھر بھی ہر شے سے عیاں جلوۂ رعنائی ہے

ان کے جاتے ہی ہوئے عیش کے ساماں رخصت
پھر وہی ہم ہیں وہی عالمِ تنہائی ہے

ایک مدت سے ہوں زنداں میں اثر کیا معلوم
صحنِ گلشن میں خزاں ہے کہ بہار آئی ہے

شاہ سید محمد شاہد فاخری دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشین ہیں، علوم مشرقیہ میں پوری دستگاہ رکھتے ہیں، شاعری کا ملکہ فطری ہے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

کب حسن کو بے پردہ و عریاں نہیں دیکھا
کب عشق کو حیران و پریشاں نہیں دیکھا

بے سود ہوا ہم کو مرا مٹی میں ملنا
جب خاک کو وابستۂ داماں نہیں دیکھا

ہے سایۂ گیسو میں وہ شمعِ رخِ انور
کیا تم نے چراغِ تہہ داماں نہیں دیکھا

ہے کشمکشِ زیست میں ہر ذرۂ ہستی
کس دل کو شکارِ غم و حرماں نہیں دیکھا

ہر لمحۂ احساس ہے اک زیست کا پیغام
بے حس میں کبھی جینے کا ارماں نہیں دیکھا

رہنے دو مجھے بے خبرِ کیفیتِ دل
احساس کا تم نے ابھی طوفاں نہیں دیکھا

اندوہ و الم حسرت و ارماں ہیں جلو میں
شاہد کو کبھی بے سر و ساماں نہیں دیکھا

ڈاکٹر حماد فاروقی بیرسٹر الٰہ آباد کے مرجع انام صوفیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، شاعری کا شوق بچپن سے ہے، کلام میں تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے، شاہ حبیب الرحمٰن اختر شاہ محمد عثمان محب کے بیٹے

اور حامد علی حامد کے شاگرد ہیں، ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے، کلام میں تصوف کا رنگ ہے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

خاک نژاد ہوں مگر مخزنِ سرِّ ناز ہوں
بلبلِ سدرہ بے خبر جس سے ہے میں وہ راز ہوں

خبر نہ تھی کہ بنا کر کے راز دار مجھے
نہ دے گا جبر و قضا پر بھی اختیار مجھے

آنسو کو دل کی آگ کیے جا رہی ہے جذب
دریا ابل رہا ہے مگر چشم تر نہیں

بازو میں جب تھے پر تو گرفتارِ دام تھے
اب دام سے چھٹے ہیں تو بازو میں پر نہیں

مذکورۂ بالا شعرا کے علاوہ موجودہ دور میں الٰہ آباد میں اور بھی موزوں طبع حضرات گذرے ہیں، اور اس وقت بھی موجود ہیں جنکے مفصل تذکرہ کی گنجایش نہیں، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں[1]:- رحمت اللہ خاں جدت (شاگرد نوح ناروی)، محمد جعفر جعفر (شاگرد قیصر الٰہ آبادی)، منوان پرشاد دانش، محمد صدر الدین رسوا، سید سراج الحق سراج (شاگرد نوح ناروی)، سعید الدین سعید، رضا احمد سحر، سید تعشق حسین تعشق، ابدی ناتھ شاطر، موہن حسین شعلہ، محمد یٰسین شمسی، دلوران شوق، شوکت علی شوکت (شاگرد نیاں الٰہ آبادی)، ہاشم علی عرفان، مظفر حسین قمر، بھگوان دین کھتری، محمود علی خاں محمود، راجندر سنگھ مضطر، برج بہاری لال موج، سید مہدی الزماں مہدی، محمد ظہور نشتر، سید محمد ہادی ہادی، سید ظہور حسن ہنر، مرزا تصدق حسین یقین، ضمیر قاسم ضمیر، سید احمد شاہ بسمل، پرمیشور ناتھ شکر [illegible]، دیوکی نندن ہنر، شریف الرحمٰن شریف، بشیشر دیال روح۔

الٰہ آباد میں اردو نثر نگاروں کی تعداد شعراء کی بہ نسبت بہت کم ہے، یہاں کے سب سے پہلے اردو نثر نگار جنکا پتہ چلتا ہے منشی چرنجی لال ہیں[2]، انکو فلسفہ اور ریاضی کا شوق تھا، ۱۸۴۷ء میں انھوں نے ایک کتاب مصباح المساحت تصنیف کی، اسکے بعد ہنری کارٹر کی تحریک اور چارلس فننگ کی اعانت سے انھوں نے علم نفسیات کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا، اسکا نام تعلیم النفس رکھا، اسی زمانہ میں الٰہ آباد کے امین الاخبار کے مدیر عزیز الدین خاں نے بنین کی پلگرمس پروگرس (Pilgrims Progress) کے طرز پر اردو میں ایک کتاب جواہرِ اصل تصنیف کی جسکی عبارت نظم و نثر دونوں میں ہے[3]۔

---

۱ چراغ محفل فصاحت ۲ داستان تاریخ اردو، ص ۱۹۳ ۳ خطبات گارساں دی تاسی (خطبہ ۱۸۶۵ء) ص ۴۷۵

غلام امام شہید امیٹھوی جو فارسی میں قتیلؔ اور اردو میں مصحفیؔ کے شاگرد تھے، اسی زمانہ میں الہ آباد میں عہدۂ خشکاری اور نظامت پر فائز تھے، فارسی کے ایک ضخیم دیوان کے مصنف ہونے کے علاوہ افشائے بہار بے خزاں، مولود شریف اور رمز الشہادتین کے بھی مصنف ہیں[1]، مفتی اکرام اللہ صدیقی (پیدائش ۱۸۳۵ء) مفتی انعام اللہ گوپاموی کے بیٹے اور الہ آباد میں مختار تھے[2]، اردو میں متعدد کتابیں لکھیں، چند کے نام یہ ہیں:- علمائے اودھ، اخبار الواصلین، تذکرۂ مصنفین، قواعد اردو، تصویر الشعرا۔ مولوی ذکاء اللہ نے جو میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے، تاریخ ہندستان کے نام سے اردو میں پہلی ہندوستان کی تاریخ لکھی، جو تین حصوں میں تقسیم تھی، اس کے بعد کئی ضخیم جلدوں میں ایک مفصل تاریخ لکھی، وہ اردو کے بڑے کثیر التصانیف مصنف ہیں، انکی تصانیف کی تعداد کئی درجن ہوگی، مولوی جسٹس کرامت حسین (پیدائش ۱۸۵۲ء وفات ۱۹۱۷ء) جو اپنی نوکری کے سلسلہ میں بہت کافی عرصہ تک الہ آباد میں مقیم رہے، انگریزی، عربی اور اردو کی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں علم الاخلاق اردو میں انکی سب سے بہتر تصنیف ہے، جسٹس کرامت حسین خود ایک بلند پایہ مصنف ہونے کے علاوہ اہل علم شعرا کے بڑے قدر دان تھے، اور ان کا مکان اہل علم کا مرکز تھا۔

موجودہ زمانہ میں مقبول احمد سمدنی نے تاریخ الہ آباد، حیات جلیل اور حیات آزاد بلگرامی تصنیف کیں، سید جلال الدین تاریخ قصائد اردو اور تاریخ ریختہ گویاں کے مصنف ہیں، حکیم احمد حسین نے تاریخ ابن خلدون کا اردو ترجمہ کیا، مہدی الزماں مہدی نے شعر و شاعری کے نام سے ایک قابل قدر کتاب لکھی، ڈاکٹر محمد اشرف مسلمانوں کے سیاسی رجحانات کے مصنف ہیں، ڈاکٹر حفیظ سید اشوک اعظم اور گوتم بدھ کے مصنف ہیں، ڈاکٹر اعجاز حسین ضامن صاحب کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے، اور چند ہی سال ہوئے جب وہ اس جگہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، اعجاز صاحب کی تصانیف کی تعداد بھی کافی ہے، ان میں سے اہم حسب ذیل ہیں: آئینۂ معرفت، مذہب اور اردو شاعری، ادبی ڈرامے، ملک ادب کے شاہزادے، میری دنیا، مختصر تاریخ ادب اردو،

[1] داستان تاریخ اردو، ص ۲۲۸ [2] خمخانۂ جاوید، ج ۵ ص ۲۱۱ [3] داستان تاریخ اردو، ص ۳۲۰

اردو ادب آزادی کے بعد، نئے ادبی رجحانات۔ اعجاز صاحب بحیثیت شاعر بھی الہ آباد میں مقبول ہیں، سید طالب علی طالب نے اکبر الہ آبادی کی شاعری پر ایک پرمغز بسیط مقالہ لکھا جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، ڈاکٹر سید رفیق حسین درسی کتابوں کے علاوہ دوسری ادبی تصانیف کے بھی مصنف ہیں، ان کے علاوہ احتشام حسین صاحب جنھوں نے اپنی تعلیم الہ آباد ہی میں مکمل کی تھی، اب بحیثیت صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد پہنچ گئے ہیں، احتشام صاحب کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے، وہ بلاشبہ اردو کے بہترین نقاد اور تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں جو حسب ذیل ہیں:- تنقیدی جائزے، روایت و بغاوت، ذوق ادب اور شعور، تنقید اور عملی تنقید، تنقیدی نظریات، ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، اردو کی کہانی، اعتبار نظر، عکس اور آئینے، افکار و مسائل، سمندر اور ساحل، اردو ساہتیہ کا اتہاس، آخر الذکر ہندی زبان میں اردو ادب کی تاریخ ہے،

الہ آباد میں اردو کی ادبی تاریخ سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت امرناتھ جھا کے ذکر کے بغیر نامکمل رہتی ہے، اگرچہ یہ دونوں حضرات خود اہل قلم نہ تھے لیکن اردو زبان سے انکی دلچسپی یہاں کی ادبی ترقی میں ہمیشہ معاون رہی، سر سپرو نے اردو زبان کی ترقی کے سلسلہ میں ہونیوالی متعدد کانفرنسوں کی صدارت کرنے کے علاوہ الہ آباد میں انجمن روح ادب کی بنیاد ڈالی جس کا افتتاح میر عثمان علی خاں، نظام حیدر آباد کی غزل سے ۱۹۴۱ء میں ہوا اور جس کے لیے سر سپرو کی کوششوں سے نظام حیدر آباد نے دس ہزار روپیہ یک مشت اور دو سو روپیہ ماہانہ دینا منظور کیا تھا، اس انجمن کے افتتاحی جلسہ کی کارروائی پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن نے مرتب کرکے چراغ محفل فصاحت کے نام سے شائع کرائی تھی، پنڈت امرناتھ جھا بھی اردو کی ہر خدمت کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے، اور ان کا مکان بھی اہل علم و شعرا کا مرکز بنا رہتا تھا، وہ خود اپنے خرچ سے اپنے مکان پر ایک سالانہ مشاعرہ کیا کرتے تھے جس میں الہ آباد و بیرونجات کے تمام ممتاز شعرا شرکت کرتے تھے۔

ٹونک کے کتب خانے

جناب حکیم محمد عمران خانصاحب ٹونکی

(۳)

علماء کے کتب خانے

ابتک جن کتب خانوں کا ذکر ہوا وہ رؤسا و امراء کے کتب خانے تھے جنھوں نے علم نوازی اور شانِ امارت کے لیے کتب خانے قائم کیے تھے، لیکن علماء کے کتب خانوں کی داستان بہت طویل ہے، ہر عالم کے ساتھ ایک کتب خانہ کا ہونا ضروری تھا، ایسے دور میں جبکہ طباعت عام نہیں تھی، ہر قسم کی کتابیں سینہ سے لگا کر رکھی جاتی تھیں، چنانچہ قیام ریاست کے بعد جس قدر علمی خاندان ٹونک آکر آباد ہوئے، وہ کتابوں کے ذخیرے بھی ساتھ لائے، جو حضرات درس و تدریس میں نمایاں مقام رکھتے تھے، ان کے کتب خانے بھی ان کی حیثیت کے مطابق ہوتے تھے، ذیل میں ایسے ہی اہل علم کے کتبخانوں کا ذکر کیا جاتا ہے،

نواب میر خاں کے ابتدائی دور میں مختار الدولہ محمود خاں کی تحریک پر ملا عرفان رامپوری کے تین بیٹے مولانا خلیل الرحمٰن، مولوی محمد مفتی اور مولوی سعد اللہ خطیب ٹونک منتقل ہو چکے تھے، یہ تینوں حضرات الگ الگ مستقل کتبخانوں کے مالک تھے، ہر کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد کافی تھی، اس لیے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے،

کتب خانہ مولوی خلیل الرحمٰن

آپ ایک عظیم کتب خانہ کے مالک تھے، اللہ نے اولاد میں بھی ایسی عطا فرمائی کہ ان میں سے ہر ایک نامور عالم یا بڑا طبیب تھا، اس لیے کتابوں کے ذخیرہ میں بھی کافی اضافہ ہوتا رہا، مولانا خلیل الرحمٰن کے جاودہ منتقل ہو جانے کی وجہ سے ان کی کتابوں کا ذخیرہ بھی تقسیم ہو گیا، ان کی

اولاد میں مولوی عبد الحئی[1] اور حکیم عفران[2] تک وہ محفوظ رہا، یہ حضرات جاودہ میں باعزت و باوقار زندگی بسر کرتے تھے، مگر بعد میں اولاد میں علم کا ذوق نہیں رہ گیا، اس لیے یہ تمام ذخیرہ تلف اور منتشر ہو گیا، البتہ طب کے کچھ قلمی نوادر ان کے عزیز و محبوب خادم منشی عباس علی صاحب میر منشی جاودہ کے پاس محفوظ ہیں، مولانا خلیل الرحمٰن کی باقی اولاد ٹونک میں رہی، ان میں مولوی عبد الحق اور حکیم عبد العلی[3] کو ان نوادر سے دلچسپی قائم رہی، اور مولوی عبد الحق نے ان کتابوں میں کافی اضافہ کیا، سنہ ۱۲۶۰ھ میں انھوں نے حج کیا، اور کافی کتابیں خرید کر ساتھ لائے، کتب خانہ کی اکثر کتابوں پر ان کی مہریں ثبت ہیں، بعد میں جب اولاد نے کتابوں کو ضائع کرنا شروع کیا تو نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں اہل علم حضرات کی کوشش سے اس کتب خانہ کو صاحبزادہ عبد الرحیم خاں کے کتب خانہ میں ضم کر دیا گیا، اسکی کتابیں اب بھی سعیدیہ لائبریری میں محفوظ ہیں،

کتب خانہ مولوی محمد مفتی

اپنے بھائی مولانا خلیل الرحمٰن کے بعد ٹونک تشریف لائے، مفتی شریعت کے عہدہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ان کے پاس بھی کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا، موصوف احقر کے جد امجد تھے، یہ ذخیرہ بحمد اللہ پانچ پشتیں گذر جانے کے باوجود ابتک پوری طرح محفوظ ہے۔ یہ کتب خانہ ٹونک کے پرائیویٹ کتب خانوں میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے، والد صاحب مرحوم، مولوی حکیم قاضی محمد عرفان خاں[4] ناظم شریعت نے اس ذخیرہ میں کافی اضافہ فرمایا، موصوف کو قلمی اور نادر کتابوں سے عشق تھا، اور بڑی توجہ اور اہتمام سے کتابوں کی حفاظت فرمایا کرتے تھے، درسی کتابوں کا بڑا ذخیرہ طلبہ کے لیے وقف تھا، اس لیے ایک ایک کتاب کے کئی کئی نسخے رکھا کرتے تھے، کتاب کیسی ہی نادر کیوں نہ ہو، اگر کسی طالبعلم کو ضرورت ہوتی تو بلا تامل دیدیا کرتے، اکثر فرمایا کرتے تھے "جس شخص نے علم اور اس کے وسائل کے سلسلہ میں بخل سے کام لیا، اس کی اولاد سے علم جاتا رہتا ہے"، اس پر آپ کا پورا عمل تھا،

---

[1] المتوفی ۱۹۱۸ء [2] المتوفی ۱۹۲۵ء [3] المتوفی ۱۳۰۸ھ [4] المتوفی ۱۹۶۲ء

مولوی سعد اللہ[1] کا کتب خانہ آپ بھی کتابوں کے بڑے شایق تھے، کتابوں کا بڑا ذخیرہ ورثہ میں ملا تھا، آپ کے صاحبزادے مولوی فضل حق[2] خطیب المتوفی ۱۳۲۳ھ فضل و کمال کے ساتھ تصنیف و تالیف کے بھی دلدادہ تھے، آپ نے کتب خانہ میں بڑا اضافہ کیا، آبائی جاگیر کی وجہ سے سرونج مالوہ جایا کرتے تھے، وہاں کے رؤسا، غلام قادر خاں وغیرہ کے کتب خانوں سے بہت سی کتابیں خریدیں، ۱۳۰۳ھ میں حج بیت اللہ کا سفر کیا اور بغداد و بصرہ وغیرہ سے بہت سی کتابیں ساتھ لائے لیکن افسوس آپ کی اولاد میں علم باقی نہ رہنے کی وجہ سے یہ ذخیرہ محفوظ نہ رہ سکا، کتابوں کا بچا کھچا حصہ مولوی عرفان صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں داخل کر دیا گیا۔

مولانا حیدر علی[3] کا کتب خانہ آپ کے کتب خانہ میں بھی کافی کتابیں تھیں، آپ کے بھتیجے مولوی احمد علی[5] سیماب آپ کے جانشین ہوئے، ان کے بیٹے حکیم سعید احمد صاحب اپنے دور کے کامیاب طبیب اور باثر شخصیت رکھتے تھے، دونوں حضرات نے کتابوں کے ذخیرہ میں کافی اضافہ کیا، لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، کتابوں کا بقیہ حصہ حکیم یحیی[4] میاں صاحب کے پاس محفوظ ہے، جس کا بیشتر حصہ طب کے قلمی نوادر پر مشتمل ہے۔

نجف علی خاں کا کتب خانہ تاج العلما نجف علی خاں قاضی جھجر، ٹونک کے اصحاب کمال میں ممتاز ترین شخصیت رکھتے تھے، مختلف علوم میں پچاس سے زاید تصنیفات آپ کی یادگار ہیں، آپ کا کتب خانہ بیش قیمت نوادر پر مشتمل تھا، دو ایک نسل تک تو اس کی کتابیں محفوظ رہیں، آخر میں ان کا حشر بھی وہی ہوا جو علما و فضلا کی نااہل اولاد کے ہاتھوں ہوا کرتا ہے، یہ جواہر پارے نااہل اولاد کے قبضہ میں خزف ریزے بنے رہے اور تقسیم ملک کے بعد یہ لوگ اس ذخیرہ کو منتشر کرکے پاکستان چلے گئے اور کتب خانہ

[1] المتوفی ۱۲۶۹ھ [2] آپ نواب وزیر الدولہ کے کتب خانہ کے بھی نگراں رہے ہیں، تقریباً تیس کتابیں آپ کی ترجمہ و تالیف کردہ محفوظ ہیں، ذاتی کتب خانہ کی اکثر کتابوں پر ہر دو پسر و پدر کی مہریں ثبت ہیں، مہروں میں یہ عبارت کندہ ہے: (۱) من حزب عوفانہ سعد اللہ۔ (۲) محمد فضل حق بن الخطیب مولوی سعد اللہ ۱۳۰۲۔ [3] المتوفی ۱۳۱۸ھ [4] حکیم سعید احمد صاحب کے پسر ہیں، موصوف کے برادر حقیقی حضرت بسمل سعیدی ٹونکی، دور حاضرہ کے مشہور و کامیاب شاعر ہیں اور دہلی میں مقیم ہیں،

بالکل ختم ہوگیا،

اسی طرح مولوی خلیل الرحمن مفتی، مولوی ضیاء النور مفتی، مولوی محمد ادیب، مولوی سراج الرحمن مولوی عبد المجید خاں صاحب، یوسف خاں صاحب اور سادات قافلہ وغیرہ کے کتب خانے انقلاب کی نذر ہوگئے،

کتب خانہ حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی آپ کی مسند درس ہندوستان کی مشہور ترین درسگاہوں میں تھی، آپ کے ذاتی کتب خانہ میں بھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، خیرآبادی خاندان سے تعلق کی بنا پر منطق و فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ کی کتابیں زیادہ تھیں، حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے حکیم محمد احمد صاحب آپ کے صحیح جانشین ہوئے، لیکن عمر نے وفا نہ کی، ان کی اولادیں سب چھوٹی تھیں، اس لیے عرصہ دراز تک کتب خانہ مقفل رہا، ایک بار والد صاحب مرحوم نے خواب میں دیکھا کہ حکیم محمد احمد صاحب فرماتے ہیں کہ قاضی جی! کتب خانہ میں پانی ٹپک رہا ہے، دوسرے دن کتب خانہ کھلوا کر دیکھا گیا، تو واقعی پانی ٹپکا تھا جس سے نقصان پہنچا تھا، ان کی حفاظت کا سامان کیا گیا، جب محمود احمد صاحب برکاتی تحصیل علوم کے بعد ٹونک تشریف لائے تو آپ نے کتب خانہ کو سنبھالا، مگر تقسیم ملک کے بعد موصوف کراچی منتقل ہوگئے، اور نادر و نایاب کتابوں کا اکثر حصہ ساتھ لے گئے، غیر ضروری کتابیں یہیں چھوڑ دیں، کچھ کتابیں ابتک آپ کے عزیزوں کے پاس ہیں،

کتب خانہ مولوی احمد مجتبیٰ مفتی آپ عدالت شریعت میں مفتی تھے، ان کے والد سید عبد الرحمن کا وطن عظیم آباد تھا، نواب وزیر الدولہ کے زمانہ میں ٹونک تشریف لائے اور اعزاز کے ساتھ زندگی گذاری، کتابوں کا ذخیرہ ان ہی کا جمع کردہ تھا، مولوی سید علی احمد محدث بہاری کے داماد تھے، اکثر کتابوں پر آپ کی مہر "ابو المجتبیٰ سید عبد الرحمن" ثبت ہے، بعد میں جب ان کتابوں کے تلف ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کا کتب خانہ عدالت شریعت کے کتب خانہ میں داخل کر دیا گیا،

کتب خانہ مولوی عبداللہ خاں نواب ابراہیم علی خاں کے دور میں درباری علما میں تھے، کتابوں کا بہت شوق تھا، اس لیے پورا کتب خانہ جمع ہوگیا، جو اہم اور نادر کتابوں پر مشتمل ہے، کتبِ متداولہ کے اردو تراجم اس کتب خانہ کی خصوصیات میں ہیں، یہ کتب خانہ بھی عرصہ دراز سے مقفل پڑا ہے،

کتب خانہ مولوی عبدالرحمن چشتی[1] حیدرآباد کے رہنے والے تھے حکیم برکات احمد صاحب سے شرف تلمذ حاصل تھا، عرصہ تک مسجد فتحپوری کے مدرسہ میں درس دیا، حکیم صاحب کے انتقال کے بعد دارالعلوم خلیلیہ میں منتقل ہوگئے اور عمر بھر درسی خدمات دیتے رہے، ان کے مزاج میں بڑی نفاست تھی، جو کتب خانے اور اس کی ایک ایک کتاب سے ظاہر ہوتی تھی، کتابیں صاف ستھری رکھنے کا بہت اہتمام تھا کتابوں کی جلدیں بڑی پاکیزہ، صاف اور خوبصورت ہوتی تھیں، اور اعلیٰ قسم کی الماریوں میں سلیقہ سے رکھی رہتی تھیں، بغیر جلد کی کوئی کتاب کتب خانہ میں نہ تھی، آخر عمر میں اپنا کتب خانہ جماعت اسلامی ہند کو ہبہ کردیا، جو ٹونک سے مرکز میں منتقل ہوگیا اور وہاں محفوظ ہے،

مولوی حیدر حسن خاں اور ان کے بھائیوں کا کتب خانہ مولوی حیدر حسن خاں شیخ الحدیث ندوہ[2]، مولوی محمود حسن خاں صاحب معجم المصنفین، مولوی محمد حسن خاں مفتی اور مولوی مظہر خاں پروفیسر میو کالج، چاروں حقیقی بھائی تھے اور ہر ایک کے پاس کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا، مولوی محمود حسن خاں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ معجم المصنفین کی ترتیب میں گذارا، اس لیے یہاں کے اکثر کتبخانے انکے کھنگالے ہوئے تھے، ریاستی کتب خانے بھی ان سے متعلق تھے، اس لیے کتابوں کا زیادہ ذخیرہ ذاتی طور پر انھوں نے جمع نہیں کیا، پھر بھی ان کے پاس کافی کتابیں تھیں، ان میں سے کچھ کتابیں قاضی عرفان صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں،

مولوی حیدر حسن خاں کی پوری عمر درس و تدریس میں گذری، اس لیے ان کے پاس کتابیں زیادہ جمع ہوئیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے جو کتابیں بھی شائع ہوتی تھیں اس کا ایک نسخہ

[1] المتوفی ۱۹۵۶ء [2] مولانا حیدر حسن خاں اڈیٹر معارف کے استاد تھے، اور ترمذی ان ہی سے پڑھی تھی۔ (م)

مولانا کے نام ضرور آتا تھا، خود مولانا کو کتابوں کا بہت شوق تھا، محلّی شرح مؤطا کا نسخہ خود مولانا نے نقل کرا کے اپنے کتب خانہ میں داخل کیا، فقہ کی مشہور ضخیم کتاب "برہان" (چار جلد) کو جس میں مصنف نے محدثانہ انداز میں مسائل فقہیہ کو ثابت کیا ہے، اسی طرح نقد حدیث سے متعلق امیر وزیر کے متن و شرح، تلقیح و توضیح کو مقامی کاتب منشی رحمت اللہ سے لکھوایا تھا اور اکثر اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے، جس کتاب کو بھی نادر پاتے اور اس کا اپنے پاس موجود ہونا ضروری خیال فرماتے تھے، فی الفور نقل کرا لیا کرتے تھے، تقسیم ملک کے بعد جب آپ کے لڑکے پاکستان منتقل ہوئے تو نادر کتابیں بھی ساتھ لے گئے، باقی کتابیں مدرسہ فرقانیہ ٹونک کے کتب خانہ میں داخل کردی گئیں،

مولوی محمد حسن خاں مفتی کا بھی ایک ذاتی کتب خانہ تھا، یہ کتب خانہ بھی تقسیم ملک کے نذر ہوا، کچھ کتابیں ضائع ہوگئیں، باقی کتابیں ٹونک ہی میں کس مپرسی کے عالم میں ایک مقام پر پڑی ہیں، آداب القضاء خصاف کی شرح صدر شہید کا ایک نادر نسخہ آپ کے کتب خانہ میں تھا جو میں نے دیکھا ہے، یہ نسخہ ۹۷۰ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام علی الحجازی ہے، اوراق ۱۵۸، خط عربی پختہ، کاغذ سفید دبیز غیر مجدول، ورق اول پر طلائی جدول ہے جس کے بالائی حصہ میں کتاب کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا ہے، درمیان کے طلائی دائرہ میں مصنف کا نام درج ہے، یہ نسخہ علامہ زین بن نجیم المصری صاحب بحر الرائق کے مطالعہ میں رہ چکا ہے، ان کے قلم کے حواشی اس نسخہ کے حاشیہ پر چڑھے ہوئے ہیں، یہ نسخہ شیخ محمد المکی الحنفی کی ملک میں رہا ہے، جو ابن نجیم کے قریب العصر تھے، ورق اول پر ان کا یہی ایک نوٹ درج ہے، ورق ۹ کے ایک حاشیہ پر تحریر ہے کہ یہ خط علامہ ابن نجیم کا ہے، ورق ۶۶ کے حاشیہ پر "ہذا خط الشیخ عبدالکریم القطبی رئیس مکہ وعین اعیانہا فی زمنہ" درج ہے، یہ نسخہ کراچی منتقل ہوگیا، اسی طرح مشکوٰۃ المصابیح کا ایک قدیم نادر نسخہ بھی اسی کتب خانہ کا دیکھنے میں آیا تھا جس پر متعدد علماء کی سندات درج تھیں۔

مولوی مظہر حسن خاں کے پاس بھی کتابوں کا ذخیرہ تھا، مگر آخری عمر میں ان کے معذور ہو جانے کی وجہ سے کتابیں ضائع ہو گئیں، ان کے انتقال کے بعد باقی کتابیں فروخت کر دی گئیں،

مولوی محمود حسن خاں کے داماد مولوی وحید حسن صاحب بھی کتابوں کے اچھے ذخیرے کے مالک تھے، اس ذخیرے میں درسی مطبوعہ کتابیں زیادہ ہیں جو ابھی تک محفوظ ہیں،

کتب خانہ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی مرحوم نوادر جمع کرنے میں شہرۂ آفاق تھے، دوسرے نوادر کے علاوہ ہزاروں روپئے خرچ کر کے نادر کتابیں جمع کی تھیں، جن میں ہر دور اور ہر صدی کے عجائبات، فنی و صنعتی مرقعے، قدیم اور نادر کتابیں، پرانے سکے، غرض ہر طرح کے نوادر کا عجائب خانہ تھا، یہ تمام ذخیرہ پنجاب یونیورسٹی کے حوالہ کر دیا گیا تھا، جو وہاں محفوظ ہے۔

مولانا سورتی کا کتب خانہ ٹونک کے قابل ذکر کتب خانوں میں مولانا محمد سورتی مرحوم کا کتب خانہ بھی تھا، یہ کتب خانہ اگرچہ ٹونک میں زیادہ دن نہیں رہا، مولانا کے انتقال کے بعد ٹونک سے باہر چلا گیا، لیکن اپنی نوعیت کا بے مثل کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم و فنون کے جواہر پارے مجتمع تھے، مولانا مرحوم معیاری اور علمی کتابوں کے عاشق اور کثیر المطالعہ تھے، بیشتر وقت مطالعہ میں مشغول رہتے تھے اور تھوڑے وقت میں بڑی بڑی کتابیں پڑھ ڈالتے تھے، ایک کتاب ختم کرتے ہی دوسری کتاب کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے، جہاں کہیں نئی کتاب کا پتہ چلتا فوراً منگاتے، رانبا، غلام رسول سورتی کو ہدایت تھی کہ جب بھی کوئی نئی کتاب طبع ہو کر آئے فوراً وی پی کر دی جائے، اس لیے وہ جہاں بھی رہے ان کے پاس کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا، موصوف خوشخط اور نہایت زود قلم تھے، بڑی بڑی نادر کتابیں خود لکھ ڈالتے تھے، جمہرۃ العرب جیسی ضخیم کتاب، موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود تھوڑے وقت میں نقل کر ڈالی، اس کے علاوہ اور بھی کئی ضخیم ضخیم کتابیں نقل کیں، اس جلیل المرتبت ادیب کے کتب خانہ میں عربی ادب، حدیث و تاریخ کی بے شمار کتابوں کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی کتابیں بھی تھیں،

موجودہ دور موجودہ دور میں جن حضرات کے پاس کتابوں کا ذخیرہ باقی ہے ان میں مولوی محمد علی خاں صاحب کا نام قابل ذکر ہے، موصوف حکیم برکات احمد صاحب کے شاگرد اور پرانے باقیات صالحات میں ہیں، آپ کے پاس کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، اسی طرح مولوی حکیم احمد حسن خاں صاحب ٹونکی مفتی مقیم جے پور کا کتب خانہ بھی کتابوں کی معقول تعداد پر مشتمل ہے، اس میں کچھ تو موروثی ہیں، لیکن زیادہ حصہ خود حکیم صاحب کا جمع کردہ ہے، طب کی کتابیں خاص طور سے اہم ہیں، اس کتب خانہ میں درجنوں کتابیں خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اور متعدد کتابیں تاریخی ندرت کی حامل ہیں، ضرورت ہے کہ ان نوادر پر علحدہ مضمون لکھا جائے۔ قبلہ والد صاحب مرحوم کے کتب خانہ کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ وہ بحمد اللہ محفوظ ہے، اور ٹونک کے کتب خانوں میں اپنے نوادر کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے، اس پر علحدہ مضمون لکھا جائے گا،

ان کے علاوہ شہر ٹونک میں بیسیوں خاندان ایسے گذرے ہیں جو اپنے دور میں علمی مرکز رہے ہیں، جن میں مذہبی اور دینی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، لیکن آج ان کا نام بھی باقی نہیں ہے۔

درسی کتب خانے شہر ٹونک جس دور میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کا مرکز تھا اُس زمانہ میں درسی کتب خانوں کی تعداد بھی کثیر تھی، ہر مدرسہ اور ہر مکتب میں ایک مختصر کتب خانہ ہوا کرتا تھا، لیکن اب یہ چیز مفقود ہے، اس لیے یہ ذخیرے بھی منتشر ہو گئے، البتہ دار العلوم خلیلیہ کا کتب خانہ، مدرسہ فرقانیہ اور مدرسہ ناصریہ ٹونک کے کتب خانے ابتک باقی ہیں، دار العلوم خلیلیہ کا کتب خانہ کتابوں کی کثیر تعداد پر مشتمل ہے، ان میں درسی کتابوں کا ذخیرہ زیادہ ہے، ضرورت ہے کہ منتظمین دار العلوم اس کا تعارف کرائیں، اگر کچھ نوادر بھی محفوظ ہوں تو ان کے حالات بھی شائع کریں تاکہ اہل علم ان سے استفادہ کر سکیں۔

مدرسہ فرقانیہ ٹونک کا کتب خانہ زیادہ وسیع نہیں، البتہ تقسیم ملک کے بعد مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے کتب خانہ کی باقی کتابیں جو انکی اولاد کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد

یہاں رہ گئی تھیں، اس مدرسہ میں داخل کر دی گئی ہیں اور محفوظ ہیں،

مدرسہ ناصریہ ٹونک بھی چونکہ عرصہ تک درس و تدریس کا مرکز رہا ہے، اس لیے اس مدرسہ میں بھی کتابوں کا کچھ ذخیرہ تھا، جو محفوظ ہے، ان مدارس کے علاوہ مدرسہ امیریہ ٹونک میں بھی درسی کتابیں کافی تعداد میں تھیں، تقسیم ملک کے بعد جب مدرسہ باقی نہیں رہا تو اس کی کتابیں سعیدیہ لائبریری ٹونک میں داخل کر دی گئیں اور محفوظ ہیں،

کتب خانوں کی داستان بہت طویل ہوگئی، خیال تھا کہ جو ذخیرے اب بھی محفوظ ہیں ان کے ذکر کے ساتھ ان کے نوادر کا بھی کچھ تذکرہ کیا جاتا، لیکن طوالت کے خیال سے اس وقت صرف کتبخانوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا، اگر اللہ تعالیٰ نے موقع عنایت فرمایا تو ان نوادر پر بھی انشاء اللہ آیندہ لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

آخر میں قارئین "معارف" کو یہ مژدہ سناتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں کہ جب سے سعیدیہ لائبریری کی کتابوں کی مفصل فہرست تیار کرنے کا موقع ملا ہے، اُس وقت سے "تذکرۂ علمائے ٹونک" ترتیب دینے کی فکر تھی، بحمد اللہ اس سلسلہ میں بہت کچھ کام ہو چکا ہے، جو باقی ہے اُس کی تکمیل کے لیے ان حضرات کے تعاون کی ضرورت ہے جن کے خاندان کسی دور میں بھی اس ریاست سے متعلق رہ چکے ہیں، اس تذکرہ میں ان کی تصانیف، علمی کاوشوں اور نسبی سلسلوں کا خصوصیت سے اہتمام کیا گیا ہے، امید ہے کہ اصحاب علم اس کام میں اپنی امداد سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

باب التقریظ والانتقاد

امام محمدؒ کی کتاب الآثار[1]

از جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

معارف کی گذشتہ کسی اشاعت میں حضرت امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ کا تعارف کرایا جا چکا ہے جس کی پہلی جلد حال ہی میں لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، اب امام محمد کی کتاب الآثار کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے، جس کی پہلی جلد حضرت مولانا ابو الوفا صاحب افغانی صدر مجلس مذکور کی تصحیح و تعلیق کے بعد مجلس علمی ڈابھیل و کراچی نے شائع کی ہے،

یہ درحقیقت حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے جس کے بارے میں امام محمد بن شجاع نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب نے چالیس ہزار احادیث و آثار سے انتخاب فرمایا ہے، اور ان کے تلامذہ نے اس کی روایت کر کے اپنی طرف سے اضافہ و ترمیم کیا جس کی وجہ سے بعد میں اس کے نسخے ان کے نام سے مشہور ہوئے، چنانچہ امام زفر بن ہذیل عنبریؒ، امام حسن بن زیاد لولویؒ، امام حفص بن غیاث نخعیؒ، امام محمد بن خالد وہبیؒ اور امام حماد بن ابو حنیفہؒ کی کتاب الآثار درحقیقت امام صاحب کی کتاب الآثار ہے، جو بعد میں ان کے تلامذہ کے نام سے مشہور ہوئی، اس طرح کتاب الآثار امام ابو یوسفؒ جو اس سے پہلے مولانا ابو الوفا صاحب کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ لجنۂ احیاء المعارف النعمانیہ سے شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آ چکی ہے، اور کتاب الآثار امام محمد جو ہمارے سامنے ہے، امام ابو حنیفہؒ کی کتاب الآثار ہے، مگر ان دونوں حضرات نے امام صاحب سے اس کی روایت کرنے کے بعد اپنے اضافہ کے ساتھ مدون کیا، اس لیے ان کی طرف منسوب ہو گئی۔

---

[1] قیمت غالباً پچیس تیس روپیے، ملنے کا پتہ: مجلس علمی ڈابھیل، ڈاک خانہ سملک ضلع سورت

امام محمدؒ کی دو کتابیں خاص طور سے ہندوستان میں بہت زمانہ سے رائج و متداول رہی ہیں، ایک مؤطا امام محمد جس کی بہترین شرح التعلیق المجد کے نام سے مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی نے شائع کی تھی، اور دوسری کتاب الآثار جو مولانا مرحوم کی توجہ سے پہلی بار لکھنؤ سے چھپی تھی، اس طباعت کا نسخہ راقم کے کتبخانہ میں موجود ہے، دوسری بار پھر لکھنؤ میں چھپی اور جب وہ اڈیشن بھی ختم ہوگیا تو تیسری بار لاہور میں چھپی، وہ بھی ایک مدت سے نایاب ہو چکی تھی، مگر چونکہ یہ داخل درس نہیں تھی اسلیے اسکی تعلیق و تحقیق اور تصحیح و تحشیہ کی طرف مؤطا امام محمد کی طرح توجہ نہ ہو سکی، حتی کہ کتابت و طباعت اور کاغذ نہایت ردی استعمال کیا گیا اور تینوں اڈیشن اغلاط سے پر تھے،

اس لیے اس اہم کتاب کو اس کے شایان شان شائع کرنے کی شدید ضرورت تھی، اور اہل علم اس کے انتظار میں تھے، چنانچہ مجلس احیاء المعارف النعمانیہ کے ارکین نے امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار کی اشاعت کے بعد ہی امام محمدؒ کی کتاب الآثار کو نئی آب و تاب کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ کیا، اور جب اسکے صدر محترم نے ہندوستان کے مطبوعہ نسخوں کے ساتھ قلمی نسخوں کی تلاش و جستجو شروع کی تو دو نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں دستیاب ہوئے، نیز ایک نسخہ آستانہ کے کتب خانہ یکی جامع میں تھا، جو ۱۲۴۷ھ کا لکھا ہوا تھا، اس کا عکسی فوٹو منگایا اور ان تینوں قلمی نسخوں سے اصل کتاب کا مقابلہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ موصل کے ایک کتبخانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس سے مقابلہ کے لیے ایک افغانی عالم کی خدمت حاصل کی جو وہیں رہتے تھے، اور یہاں سے اصل نسخہ بھیجکر مقابلہ کرایا، اس طرح مدت کی محنت شاقہ کے بعد یہ نسخہ تصحیح و مقابلہ اور تعلیق و تحشیہ کی تمام خوبیوں کے ساتھ طباعت و اشاعت کے قابل ہو گیا، مگر اس کے لیے زر کثیر کی ضرورت تھی جس کی بظاہر فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، اور معاملہ لیت و لعل میں پڑا ہوا تھا کہ مجلس علمی ڈابھیل و کراچی کے محسن خاص مرحوم مولانا محمد بن موسیٰ میاں (افریقہ) نے مجلس علمی کی طرف سے اسکی طباعت و اشاعت کی پیشکش کی، اس طرح امام محمد کی کتاب الآثار مولانا ابوالوفا صاحب افغانی صدر لجنہ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد اور مولانا محمد بن موسیٰ میاں، رکن رکین مجلس علمی ڈابھیل کی توجہ سے اہل علم کے سامنے بڑی آب و تاب کے ساتھ آگئی، اور ماضی میں اس کتاب کی جو حق تلفی ہوئی تھی سب کا تدارک ہو گیا،

حضرت امام محمدؒ نے اس کتاب میں عام طور سے صحابہ اور تابعین کے آثار کو فقہی ابواب پر جمع کیا ہے، اسی لیے اس میں احادیث مرفوعہ کے مقابلہ میں آثار موقوفہ بہت زیادہ ہیں، اس کتاب کا مقصد صحابہ اور تابعین کے آثار کو یکجا کر کے یہ دکھانا ہے کہ جن احادیث کے آثار سے موافقت ہوتی ہے وہ معمول بہا ہیں، گویا صحابہ اور تابعین کے آثار احادیث رسول کے لیے شواہد و دلائل ہیں جن کو جمع کیا گیا ہے کیونکہ مختلف فیہ احادیث کے بارے میں صحابہ اور تابعین کا تعامل معیار و حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اختلاف ہوگا تو فیصلہ کے لیے صحابہ کے اقوال و افعال کو معیار ماننا پڑے گا، کیونکہ وہ منشائے رسول اور احکام دین کے زیادہ عالم تھے، اور انھوں نے اولیٰ اور اصح پر عمل کیا، اسی طرح اگر صحابہ کے اقوال میں اختلاف ہو تو تابعین کا مسلک معیار ہوگا اور ان کے آثار کی روشنی میں صحابہ کے اقوال کو دیکھا جائیگا، اور جب تابعین کے اقوال و افعال میں اختلاف ہوگا تو وجوہ ترجیح کی بنا پر بعض صحابہ کے اقوال کو ترجیح دیجائے گی، اسی مقصد کے لیے ائمہ نے علمائے صحابہ و تابعین کے آثار کو مستقل طور سے مدون کیا، چنانچہ کتاب الآثار امام محمدؒ بھی اسی سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی ہے،

اس کتاب میں ان اکابر و اعیان صحابہ کے اقوال و افعال اور فیصلے مروی ہیں جو جماعت صحابہ میں مرجع و حجت تھے، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرات خلفائے اربعہؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اقوال و فتاویٰ درج ہیں، جو حضرت انس بنؓ مسعود کے کبار تلامذہ سے مروی ہیں، جیسے امہات المومنین میں حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ، ان کے علاوہ صحابیات میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ، حضرت ام سلیمؓ اور حضرت ام عطیہؓ وغیرہ کی مرویات ہیں، اور تابعین میں امام ابراہیم نخعیؒ، امام شعبیؒ، امام حسن بصریؒ، امام ابن سیرینؒ، امام سعید بن جبیرؒ، امام سعید بن مسیبؒ، امام علی زین العابدینؒ، امام محمد بن حنفیہؒ جیسے کبار تابعین کے فتاوے اور اقوال ہیں، خاص طور سے امام نخعیؒ سے زیادہ تر روایات جو حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہیں،

جب کسی مسئلہ میں صحابہؓ سے متضاد و مختلف روایتیں ہوتی ہیں، تو وہ طریقہ اختیار فرماتے ہیں، جو اقرب الی التفقہ ہوتا ہے، اور تابعین کے اختلاف میں ان ہی کی طرح خود بھی تفقہ فی الدین اور اجتہاد سے کام لیتے ہیں، جو ان کے شیخ امام ابوحنیفہؒ کے طریقہ پر ہوتا ہے، اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ کے اس مسلک کو اختیار کرتے ہیں جو ابراہیم نخعی سے مروی ہوتا ہے، لیکن اگر اس میں اپنی فقہی صوابدید اور تفقہ کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو پھر امام نخعیؒ کے قول کو بھی ترک کر دیتے ہیں، اور صاف طور سے لا تاخذ بقول ابراھیم بل بقول فلان وفلان کہتے ہیں، جیسا کہ کتاب الآثار میں جگہ جگہ اس کی صراحت ملتی ہے، اور ان کی دوسری کتابوں میں بھی یہ اجتہادی شان اور فقیہانہ فکر پائی جاتی ہے،

یہ تو اصل کتاب کے متعلق چند معلومات تھیں، حضرت مولانا ابوالوفا صاحب افغانی کی تعلیق کی افادیت و اہمیت کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں، جنھوں نے ان کی علمی و فقہی کاوشوں کو ائمۂ احناف کی متعدد امہات کتب کی اشاعت میں دیکھا ہے، مولانا نے نہایت عقیدت اور بڑی دقت نظر سے اس کا تحشیہ فرمایا ہے، آثار کی تخریج، ان کی اسانید کی تحقیق، متضاد آثار میں تطبیق، غریب لغات کا حل، نیز یہ کہ امام محمدؒ نے اپنی دوسری تصنیفات میں فلاں باب میں کیا ذکر کیا ہے، اور ائمۂ فقہاء کی تفریعات کیا ہیں، رواۃ احادیث و آثار کے تذکرے، الغرض مولانا کی فقہی بصیرت اور تحقیق کد وکاوش نے کتاب کی افادیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، ضرورت تھی کہ اس کتاب کا تعارف بھی مفصل کرایا جائے، مگر وقت کی تنگی کی بنا پر اسی پر اکتفا کرنا پڑا ہے،

مطبوعات جدیدہ

مکتوب مدنی: مترجمہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی صفحات ۳۶ تقطیع متوسط، عمدہ ٹائپ، کاغذ وطباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی و دینی یادگاروں میں اُن کا مشہور اور اہم رسالہ مکتوب مدنی بھی ہے، جو اسماعیل بن عبد اللہ رومی ثم مدنی کے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں انھوں نے شاہ صاحب سے شیخ اکبر کے وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانی کے وحدت شہود کی وضاحت چاہی تھی، شاہ صاحب نے ان دونوں نظریوں کے فرق و اختلاف کی توجیہ اور ان میں تطبیق کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ ان کی اصل حقیقت پوری طرح ظاہر ہوگئی ہے، تمہید میں ایک بصیرت افروز اصول بیان کیا گیا ہے جس سے اس قسم کے اختلافی مسائل خصوصاً تصوف کے بعض مباحث کے اختلافات کی عدم اہمیت ظاہر ہوتی ہے، یہ تمہید اُن لوگوں کے شبہات کا مسکت جواب بھی ہے جو محض اختلافات کی وجہ سے کسی چیز کی اصل حقیقت کا انکار کرنے لگتے ہیں،

یہ مفید رسالہ عربی میں تھا اور شاہ صاحب کے مجموعۂ مکاتیب کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، ادارۂ ثقافت کے رکن مولانا محمد حنیف صاحب ندوی نے اردو خواں اصحاب کے استفادہ کے لیے اس کا نہایت سلیس اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے، اگر وہ اس پر ایک مقدمہ لکھ دیتے جس میں رسالہ کے متعلق ضروری معلومات اور حواشی میں تشریح طلب مقامات کی وضاحت ہو جاتی تو ناظرین کو اس کے سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوتی،

صیانۃ الحدیث حصہ اول

مرتبہ مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی، جھنڈانگری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۲۸، قیمت :- ڈو روپیہ ۵۰ پیسے

پتہ : مولانا عبدالرؤف رحمانی، جھنڈانگری کیرآف قاضی تبارک اللہ، ڈاکخانہ رام وت گنج ضلع بستی،

فتنۂ انکار حدیث کی تردید میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک مفید کڑی ہے، اس میں امت کی اُن خدمات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو احادیث کی حفاظت وصیانت کے لیے کی گئی ہیں، جس سے احادیث کی حجیت و استناد پوری طرح ثابت ہوجاتا ہے اور منکرین حدیث کے تمام اعتراضات کا تشفی بخش جواب بھی ہوجاتا ہے، کتاب کے مباحث خصوصاً حفظ احادیث کے تسلسل کی بحث نہایت فاضلانہ اور محققانہ ہے، لیکن مولانا نے بعض قرآنی آیات مثلاً انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون - ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ - الذین کذبوا بالکتاب وبما ارسلنا بہ رسلنا فسوف یعلمون - وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ اور اسی طرح سرورق پر اللہ نزل احسن الحدیث وغیرہ کو جس مقصد کے لیے نقل کیا ہے، ان سے اسکی کوئی تائید نہیں ہوتی، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کی تقلیل روایت کا یہ سبب کہ زمیندارانہ اشتغال کی بنا پر ان کو خدمت نبوی میں حاضر ہونے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا، صحیح نہیں ہے، معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے، حضرت ابوبکرؓ تو دربار نبویؐ کے سب سے زیادہ حاضرباش تھے، درحقیقت انکی تقلیل روایت کے اسباب دوسرے تھے، جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

صحیفۂ محبت

:- مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب، صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۹۰ مجلد، قیمت: صر پتہ : ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

مہدی حسن مرحوم کے علمی و ادبی مضامین افادات مہدی اور دوستوں کے نام خطوط مکاتیب مہدی کے بعد اب یہ ان کی تیسری یادگار شائع کی گئی ہے، جو ان کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی محبوب اور صاحب مذاق بیوی مہدی بیگم کو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک لکھے تھے، اس میں ۱۹۵ خطوط شامل ہیں، ہر خط میں الفت و محبت کی سرشاریاں اور شوہر کے عاشقانہ جذبات کی ترجمانی ہے، خطوط کے وہ فقرے حذف کر دیے گئے ہیں، جن میں زیادہ شوخی اور بیباکی تھی، اس کے باوجود بعض فقرے سنجیدہ طبائع کے لیے بار ہیں، خلوت کے معاملات کو جلوت میں لانا ہماری قدیم روایت اور مشرقی وضع کے بھی خلاف ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان خطوط میں ادب و انشاء کے جو چٹخارے اور مہدی مرحوم کی زبان کی پاکیزگی اور ان کی تحریر کی دلکشی کے جو نمونے ہیں اُن سے اصحاب ذوق خصوصاً مہدی مرحوم کے قدردانوں کو محروم رکھنا مناسب نہ تھا، شروع میں ڈاکٹر محمود الٰہی کا مقدمہ ہے جس میں گورکھپور اور مہدی مرحوم کے متعلق بڑے مفید معلومات تلاش و محنت سے لکھے گئے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے علاوہ خود بیگم مہدی بھی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے ان اوراقِ محبت کو محفوظ رکھا اور بے تکلف اُن سے قدردانوں کو بھی ...... لطف اندوز ہونے کا موقع دیا،

تذکرۂ طالب آملی معہ انتخاب کلام

مرتبہ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب، تقطیع خورد، کاغذ وطباعت اچھی، باریک ٹائپ، صفحات ۱۳۸ مجلد، قیمت صر پتہ :- فیروز سنز بندر روڈ، کراچی،

شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے دربار کے ملک الشعراء اور فارسی زبان کے مشہور اور باکمال شاعر طالب آملی کے دیوان کے قلمی نسخے متعدد کتبخانوں میں ملتے ہیں، خواجہ عبدالرشید صاحب کو جو بڑے صاحب مذاق ہیں، ایک قدیم ترین نسخہ جو صاحب دیوان کی وفات کے کل چھ سات سال

بعد ۱۰۴۲ کا لکھا ہوا ہے، مل گیا، انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق اس ضخیم دیوان کے چیدہ اشعار منتخب کرکے جو مثنویات، غزلیات اور رباعیات سب پر مشتمل ہیں، بجوالصفحات ایک مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے، مقدمہ بڑے تلاش و تفحص اور ژرف نگاہی سے لکھا گیا ہے، اس میں شاعر کے سوانح حیات، خصوصیات کلام، دیوان کے مختلف نسخوں اور موجودہ نسخہ کے متعلق مفید معلومات درج ہیں، طالب آملی کا دیوان اب تک طبع نہیں ہوا ہے، اس لحاظ سے یہ انتخاب بھی فارسی ادب کا مذاق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

عبقریت محمدؐ :- ترجمہ جناب فروغ احمد صاحب تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۸، قیمت عہ/ پتہ: ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز کشمیری بازار، لاہور ۸/

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اس کتابچہ میں آپ کی عملی زندگی کے بعض پہلوؤں کا مرقع پیش کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالص روحانی کمالات سے قطع نظر انسانی اوصاف و اخلاقی کمالات کے اعتبار سے بھی آپ کی شخصیت بڑی جامع تھی، اور آپ کی مدبرانہ صلاحیت، انتظامی بصیرت اور سیاسی قابلیت بھی بے مثال تھی، یہ کتابچہ عربی زبان میں تھا، اور مصر کے مشہور صحافی اور اہل قلم عباس محمود العقاد کے قلم کا رہین منت ہے، فروغ احمد صاحب نے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

آئین وفا از ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت نہایت نفیس، صفحات ۱۰۴، مجلد قیمت ستے/ پتہ: مکتبہ دانش افروز ۴۵۔ ارجن روڈ، کرشن نگر۔ لاہور۔

جناب صفدر حسین ایک قادر الکلام شاعر ہیں، مرثیوں کا انکو خاص ذوق ہے، چنانچہ انکے مرثیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، یہ مجموعہ بھی تاریخ کربلا کے ایک اہم کردار حضرت عباس بن علی کا مرثیہ ہے جس میں انکے مختلف اوصاف و کمالات خصوصاً ایثار و جانبازی اور حضرت امام حسین سے انکے اخلاص و وفا کا نہایت کامیاب مرقع پیش کیا ہے۔

"ض"

جلد ۹۸ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۶۶ عیسوی عدد ۵

مضامین